مُرقع کالج

جس میں

حالات و روایات محمڈن کالج علیگڈھ کے تفصیلی درج کئے گئے ہیں

مُصنفہ

جناب مولوی محمد بدرالدین صاحب بی۔ اے۔
ایل۔ ایل۔ بی۔ علیگ وکیل ہائیکورٹ۔ مرادآباد

حسب فرمائش

جناب مولوی ایس ابن علی صاحب ایڈیٹر و پروپرائٹر اخبار نیر اعظم
مرادآباد
و دیگر احباب محمڈن کالج علیگڈھ

فروری سنہ ۱۹۱۲ء

نامی مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مرادآباد
میں ایس ابن علی نے چھاپا اور شائع کیا

بار اول ۱۰۰۰ جلد

قیمت فی جلد ۱۲ آنہ

فہرست مضامین مُرقّع کالج

کالج کی زندگی پہ ایک غائر نظر ڈالنے سے اُس کی خوشنما حالت کے باریک ریشمی پردہ سے دیکھنے والے کے لئے اندرونی جھلک کا ایک نظارہ پیش نظر ہوجاتا ہے اس کی حالت اِس زمانہ میں بالکل اس تھیٹر کی سی ہے کہ جس کا پنڈال نہایت شاندار ہو۔ سامان اعلےٰ اور ارفع ہو۔ پردے بے مثل ہوں۔ ایکٹروں کا لباس آنکھوں کو خیرہ کیئے دیتا ہو۔ لیکن اُس میں مغنیوں کا نام نہ ہو۔ ایکٹ کرنے والوں میں سرے سے ایکٹ کرنے کا سلیقہ ہی نہ ہو۔ اور اگرچہ لوگ اُس میں داخل ہونے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہوں لیکن داخل ہوتے ہی جوں ہی کہ پردہ اُٹھے اور تماشہ شروع ہو تو یہ پڑھتے نظر آئیں کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں جس کا　　جو چیرا تو ایک قطرۂ خون نکلا

سرسید مرحوم کا جو منشا کالج کے بنانے کا تھا وہ ہمارے ہاتھوں بالکل فوت ہوگیا اور اُس کا خون ناحق ہماری گردن پر رہا۔ سید مرحوم کا منشا اس دارالعلوم کی بنیاد ڈالنے کا اپنی قوم میں تین حالتیں پیدا کر دینے کے لئے تھا۔

(۱) ہندی مسلمانوں کا علمی احیار۔ (۲) مسلمانوں میں سچی اور صحیح قومی روح

پیدا کرنا (۳) ایسے افراد پیدا کرنا جو صحیح معنوں میں شہری (citizens)
کہلائے جاسکیں ؟

اب اپنی رائے کے عیب و صواب معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ
واقعات کالج پر نگاہ ڈالی جائے اور یہ دکھایا جائے کہ کس حد تک ارکان کالج نے
بانئے کالج کے منشا کو سمجھا اور کہاں تک اُس میں کامیابی حاصل ہوئی ہے ؟

علمی احیاء ہر قوم و ملت کے علمی احیاء کے یہ معنے ہیں کہ اُس قوم میں بڑے
بڑے مصنف اور مؤلف پیدا ہوں۔ اُس میں بڑے بڑے ادیب۔ فلسفی۔ مصوّر
شاعر۔ مؤرخ ہوں۔ اُس کے افراد جادو بھری تقریریں کرنے والے ہوں۔ فصیح و
بلیغ آرٹیروں سے اُس کا قومی اسٹیج بھرا نظر آتا ہو۔ اُس کی ایک جماعت اختراع
میں کمال رکھتی ہو۔ اُس کے افراد فنونِ لطیفہ میں دلچسپی کا نہ صرف احساس رکھتے
ہوں۔ بلکہ اُن میں ید طولےٰ اُن کو حاصل ہو۔ علمی احیاء کے معنی صرف گریجوئیٹس پیدا
کرنا نہیں ہیں۔ اگر یہ بھی ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایسے بالغ العلوم پیدا کئے
جائیں کہ جو دنیا کی ترقی کی دوڑ میں "چار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق ہوں۔ پچاس
سالہ تعلیم میں کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ علیگڈھ کالج نے معدودے چند طالب علم ہی ہر شعبہ
میں صحیح مذاق علمی رکھنے والے پیدا کئے ہوں۔ غالباً ہزاروں کی تعداد میں کالج سے
بالغ العلوم اور کامل العلوم نکلے ہونگے مگر کوئی بھی نام ایسا بتایا جا سکتا ہے کہ جو اعلےٰ
درجہ کا ادیب ہو۔ مستند مورخ ہو۔ مسلّمہ فلسفی ہو۔ اُستاد الشعراء نہ سہی صحیح معنوں
میں شاعر ہو۔ مشہور آرٹسٹ ہو۔ یا کسی کارآمد کتاب کا مصنّف یا مؤلف ہو یا پبلک
پلیٹ فارم کا زبردست مقرر ہو۔ کالج کی کل زندگی کو ملاحظہ کیجیے تو آپ ایک علمی
سوسائٹی بھی نہ پائیں گے کہ جو واقعی طور پر علمی ذوق و شوق کو پیدا کرنے اور عقل
انسانی کو چمکانے اور جلا دینے کی روح رکھتی ہو۔ یوں تو درجنوں سوسائٹیاں

وہاں بلنگی بنگالی ہسٹاریکل۔ فلوزافیکل پرشین سوسائٹیاں۔ اسپیکنگ کلبز اور انجمن ترقیٔ اردو۔ مگر یہ نام ہی نام ہیں۔ ورنہ وہاں جاکر دیکھئے تو ایک بازیچۂ اطفال ہے کہ جو منٹ بھر میں بنتا اور بگڑتا ہے۔ اور جن میں علمی شان قطعاً مفقود ہے اگر اس امر کے بطلان کی کسی کو جرأت ہے تو وہ علم الاعداد اور واقعات کے میدان میں آئے اور دکھلائے کہ ان سوسائٹیوں کے ممبروں کے کتنے علمی مضامین رسالوں کی صورت میں شائع ہوکر ملک کو فائدہ پہنچا چکے ہیں اور نہ ملک کو سہی تو صرف طلبار کالج ہی اُن سے استفادہ حاصل کر چکے ہوں:۔

اُس قوم میں کیا ترقی ہوسکتی ہے کہ جسکے معزز اور قابل افراد علمی سوسائٹیوں میں حصہ نہ لیں اور اُن کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ وہ کالج اِن سوسائٹیونکو کیا چاٹیگا کہ جس کے ارکان علمی کچھ وقت بھی اُن میں جان ڈالنے کے لئے نہ دے سکتے ہوں وہ قوم اپنے احیار کا کیا دعوےٰ کرسکتی ہے کہ جس میں سے اب تک ایک بھی مصنّف۔ مؤلف۔ مورّخ۔ فلسفی۔ مصوّر۔ ادیب یا اختراع کرنے والا پچاس سالہ کوششوں میں نہ پیدا ہوسکا ہو۔ یہ وہ مدت ہے کہ جس میں قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں جس میں عروج و زوال کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ ممالک ایشیا ہی میں جاپان کی ایک ایسی زندہ مثال ہے کہ جس نے پچاس سالہ مدت میں وہ کچھ کر دکھایا کہ جس کا لوہا یورپ تک کو ماننا پڑا۔ کیمبرج اور آکس فورڈ کا چرچہ اُتارنیکا نام ہی نام ہے ورنہ یہ امر کبھی خیال میں بھی نہیں آتا کہ کیمبرج اور آکسفورڈ ہی وہ علمی مقامات ہیں کہ جہاں سے ٹینیسن۔ ملٹن۔ شیکسپیئر۔ کرزن۔ گلیڈسٹن وغیرہ جیسے لوگ نکلے ہیں۔ جنہوں نے اپنی قوم کو ترقی کے اعلےٰ معیار پر پہنچا دیا۔ یہ لوگ کہیں آسمان سے نہیں اُترے تھے بلکہ ان ہی درسگاہوں کے اکثر اُن میں سے بالغ العلم تھے۔ کیا اسکی امید کی جاسکتی ہے کہ یہی رفتار کالج کسی زمانہ میں محسن الملک۔ سید محمود

اقبال - ڈاکٹر بوس - گوکھلے - سر بیندر وناتھ - ڈاکٹر راش بہاری اور سید علی جیسے لوگ پیدا کر سکے گی - ہرگز نہیں - "این خیالست و محالست وجنوں" کالج کے علمی کارناموں کی "دو منتھلی" ہی ایک ایسی جاگتی سوتی تصویر کالج میں موجود ہے کہ جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ کالج علمی مذاق رکھنے میں کورا ہے - یہ وہ ماہواری رسالہ ہے کہ جو مادر کالج کا آرگن سمجھا جاتا ہے - مالی حالت کا تو اس وقت ذکر کرنا ہی فضول ہے لیکن قلمی حیثیت سے اُس کی امداد کرنا طلباء کالج و ممبران اسٹاف و اراکین کالج کو ایک پہاڑ نظر آتا ہے - اسی لئے کبھی اُس میں جان پڑ جاتی ہے کبھی دم توڑنے لگتا ہے کبھی وہ سکتہ میں آجاتا ہے - غرض اسی کس مپرسی کی حالت میں وہ اپنی عمر گذار رہا ہے چہ نسبت موجودہ طالب علم کالج - ایک معتدبہ تعداد ممبران اسٹاف اور ہزاروں کی تعداد میں پرانے طالبعلموں کے ہوتے ہوئے وہ کبھی علمی رسالہ نہ بن سکا اور کبھی وقت پر نہ نکلا - اگر قومی کالج کا یہی علمی رسالہ ہے اور اسی کا نام علمی دلچسپی اور احیاء ہے - تو معلوم شد بافندگی بافندگی :-

امتار کالج کا ایک سنڈیکیٹ ہے کہ جس میں تقسیم کام کے اصول پر ہر ایک کام ایک ایک ممبر کے سپرد کر دیا گیا ہے - یہ کالج کی وہ وزارت ہے کہ جو مختلف شعبوں کے کام کی محافظ اور ذمہ دار ہے - اِس وزارت کے ممبر تعلیم کیا بتا سکتے ہیں کہ اُنھوں نے صیغۂ تعلیم کے کن کن شعبوں پر کن کن صورتوں سے غور کیا ہے اور کتنی رپورٹیں اور تجاویز اس محکمہ کی بہتری اور ترقی کے لئے تجربہ اور تحقیق کی بناء پر تحریر کی ہیں ؟ رپورٹ لکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سال بھر میں گھر بیٹھے دو چار صفحہ لکھ کر بھیج دیئے اور بس - کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ کتنی مرتبہ اُنھوں نے ماہران تعلیم سے مختلف شعبوں کے حُسن و قبح پر بحث کی ہے اور کتنے مختلف دارالعلوموں میں جا کر اُن شعبوں کو ملاحظہ کیا ہے اور کتنی مرتبہ اُن اُمورات

کو جو اُن شعبوں کے بہتر کرنے کے لئے ضروری ہیں سنڈیکیٹ اور سیکریٹری کالج کے سامنے پیش کیا ہے ؟۔ کیا وہ دکھا سکتے ہیں کہ اُنہوں نے کیا کیا سعی علمی سوسائٹیوں کے ترقی دینے میں کی ہے ؟۔ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ کس معیار کا شخص کس کام کے لئے موزوں ہے ؟ ۔

کیا ممبر دارالاقامہ اس امر کو بتلا سکتے ہیں کہ کتنی مرتبہ سال بھر میں طلبا ر کالج سے وہ بورڈنگ ہاؤس میں آکر ملتے ہیں اور اُن کے خیالات سے تبادلہ خیال کرتے ہیں کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ٹیوٹوریل سسٹم میں کیا نقص و قبح کالج کی زندگی پر کام کر رہے ہیں اور پراکٹوریل سسٹم میں کیا فوائد اور نقصانات تھے اور اب معاملات کی کیا صورت ہے ؟ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ کتنے وفد طلبا ر کالج کے اُنہوں نے اپنے یہاں تفتیش حالات کے لئے بلوائے اور اُن سے گفتگو کی ؟ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ بورڈنگ ہاؤس کی اچھی حالت کرنے میں اُنہوں نے کسقدر وقت صرف کیا اور اُس کے متعلق کیا کیا تجویزیں امنا ر کالج۔ سیکریٹری اور ممبران اسٹاف کے سامنے پیش کیں ؟۔ اور اُنہوں نے کون کون سی تجاویز و تدابیر طلبا ر کالج میں اتحاد و اتفاق قائم رہنے اور یک رنگی پیدا ہونیکے لئے کیں ؟۔ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ کتنی مرتبہ ممبران اسٹاف سے ملکر معلم و متعلم کے آپس کے اچھے برتاؤ رکھنے کے لئے بحث کی ؟۔

کیا ممبر بلڈنگ بتلا سکتے ہیں کہ اُصول تعمیری کیا چیز ہے ؟ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ نقشہ کا اُلٹا سیدھا کیا ہوتا ہے ؟ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ کس نمبر کی سرخی اور چونہ کا مکسچر استحکام عمارت کیلئے ضروری ہے کیا وہ عمارات کے نقص و قبح کو دیکھ سکتے ہیں ؟ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ عمارت کی مقابلہ لاگت کس اصول پر قائم کیجاتی اگر یہ نہیں ہے تو پھر بتلایئے کہ وزارت کس کام کی ہے اور اس کے ممبر کسطرح اپنے اپنے شعبوں کی نگرانی کے ذمہ دار کئے گئے ہیں ۔ اگر ایسی ہی وزارتوں سے ہر ملک میں کام لیا جاتا تو غالباً ہر شعبہ قعر مذلت میں وہاں کا نظر آتا۔ دنیا اس پر

متفق ہے کہ جو جس چیز کا ماہر ہے وہی وزارت میں اُس شعبہ کا قلمدان سنبھالے مگر یہاں معاملہ اکثر برعکس رہتا ہے۔ پھر طرفہ یہ ہے کہ اگر اس حسن انتخاب پر اعتراض کر دیا تو غضب آگیا۔ حق الامر کو ظاہر کر دینا ان کے یہاں ایسا جرم ہے کہ جس کی معافی نہیں۔ ایک مرتبہ ایک سربرآوردہ رُکن کالج سے گفتگو کرنے پر اُن کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ سُنکر کس قدر تعجب و افسوس ہوا کہ "صاحب اب کالج میں ترقی کیسے ہو سکتی ہے۔ اور معاملات بہتری کی صورت کیسے پکڑ سکتے ہیں۔ جب باہر کے لوگ مثلاً بمبئی بنگال اور مدراس کے اصحاب کالج میں آکر اُس کے معاملات پر بحث کرتے ہیں اور رہبر بنتے ہیں۔ وہ بھلا سید مرحوم کی پالیسی اور روایات کو کیا جانیں۔ کالج کی بہبودی تو اسی میں ہے کہ ہم جو سید کے دیکھنے والے ہیں۔ اُن پر معاملات کا انحصار کر دیا جائے اور وہ دور ہی سے دیکھیں۔ پھر دیکھئے کالج کیا ترقی کرتا ہے۔" صرف اس ایک تنہا ہی مثال سے خیال کر لیجئے کہ ارکان کالج میں کس حد تک تنگ خیال لوگ موجود ہیں:۔

اسٹاف جو منبع علم و فضل ہوتا ہے اور جو علمی شجر کی اصل ہوتا ہے۔ جو اپنی نور کی شعاعوں سے دل و دماغ کو منور کرنے میں آفتاب کی مثل ہے۔ اُس کی یہ حالت ہے کہ اُس کے ممبروں میں علمی انہاک علمی مذاق قطعاً مفقود ہے۔ محمڈن کالج میں آپ کسی پروفیسر میں یہ ذوق نہ پائیں گے کہ وہ اپنے مضمون میں حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہو اور طلباء کو ایک عالمانہ لکچر سے استفادہ پہنچانے کا خیال کرتا ہو۔ علمی مباحثات اور اذکار کی بجائے یا تو آپ اُن کو طلبا سے پارٹی فیلنگ کے معاملات میں مباحثہ کرتے ہوئے پائیں گے اور یا کالجی سیاسیات میں گوہر افشانی فرماتے ہوئے دیکھیں گے۔ کالج میں سب سے بڑی تعریف اُس پروفیسر کی ہوتی ہے کہ جو اپنے مضمون پر بلا دیکھے اور طیاری کئے لکچر دے جاہے وہ لکچر صرف الفاظ کا

مجموعہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور یا اُس پروفیسر کی تعریف میں زبان رطب اللسان ہوتی ہے کہ جو خوشامد پسند ہو اور عمائدوں سے اچھی طرح پیش آتا ہو۔ وہ ہونہار طالب علم کالج جو مغربی ڈگریاں لیکر کالج میں پروفیسری کے عہدہ پر ممتاز ہوتے ہیں اُن سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مضمون میں اپنا کافی وقت صرف کرینگے اور نہ صرف کالج کے طلبا کیلئے بلکہ ہندوستان کے باشندوں کے لئے اس مضمون کے زر و جواہر پیش کرینگے لیکن وہ "ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد" کے مصداق بن جاتے ہیں اُن کے متعلق صرف یہ لکھدینا کافی ہے۔ کہ

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا   کار طفلاں تمام خواہ شُد

اس امر کے فیصلہ کے لئے کہ مقصد نمبر ۲ میں کالج کی تعلیم میں کہانتک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ طلبا ر کالج کی حالت کا تین حیثیتوں سے اندازہ کرنا ضروری ہے

(ا) مذہبی حیثیت   (ج) قومی حیثیت   (د) اخلاقی حیثیت

اول الذکر حیثیت میں کوئی شخص یہ امید نہیں کرتا کہ کالج سے امام غزالیؒ یا امام ابی یوسفؒ جیسے پیدا ہونگے اور نہ ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کا محمڈن کالج کا ادعا ہے۔ لیکن یہ توقع ضرور ہے کہ وہ اسلام کے سچے اور سادہ اُصولوں پر چلنے والے اصحاب پیدا کرے گا۔ لیکن کیا آپ اُس نصاب مذہبی سے جو کالج میں مروج ہے امید کر سکتے ہیں کہ وہ اسلام کے سادہ اُصولوں کی ذرا بھی وقعت کرنا سیکھیں گے میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کے معنے وہ اسلام ہے کہ جسکو ہمہ شما مولوی مرتب کرکے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بلکہ میں اُن عمدہ اصولوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ جو قرون اولے میں خلفائے راشدین اور اصحاب کبار و ائمۂ اطہار کا مسلک تھے اور جو علما ئے اسلام ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کالج کی مذہبی پالیسی چونکہ وہ مختلف المذاہب اور ملل کے لوگوں کو تعلیم دیتا ہے ہمیشہ یہ رہی ہے کہ صرف

اُسی حدتک مختلف مذاہب کے اصحاب کو تعلیم دیجاتی ہے کہ جو اُن کے لئے اشد ضروری ہو اور جو کالج کے شروع کے پروگرام میں شامل ہو چکی ہے اور یہی سب سے بہتر اصول کالج کی زندگی کی استواری کے لئے تھا۔ اس اُصول سے قدم باہر نکالنا ہی غلطی ہے مذہبی رنگ میں جو اعتدال سے زیادہ رنگے ہوئے ہیں وہ کالج کی زندگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اُس کو کیا پالیسی اختیار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس اصول سے باہر سب سے پہلے قدم نواب وقار الملک بہادر نے قادیانیوں کے لئے ایک علیحدہ عبادت گاہ تجویز کر کے رکھا اور چند متعصب مولویوں کے اثر سے انھوں نے سنی طلباء کے لئے مختلف دار الاقاموں میں امام مقرر کر کے کالج کی مفید مذہبی پالیسی کو ایک حد تک متزلزل کر دیا اور مذہبی مناقشات اور مباحثات کا دروازہ کھل گیا جسکی وجہ سے ایک قسم کی تفریق پیدا ہوئی اور جو شیعہ طلباء پر اپنا اثر کئے بغیر نہ رہی۔ اور جس پر شیعی متعصب رہبران دین نے گہرا رنگ چڑھانے کی کوشش کی۔ اس سے ناظرین ہرگز یہ مطلب نہ سمجھیں کہ میں طلباء کالج میں لوجہ اللہ مذہبیت پیدا کرنے کے مخالف ہوں بلکہ اُس درجہ کی مذہبیت پیدا ہونے کے مخالف ہوں کہ جو کالج کی زندگی کے لئے مضر ہے۔ بجائے۔ اس کے کہ ہر دار الاقامہ میں مختلف مذاہب کے معابد اور امام مقرر ہوں۔ یہ مناسب ہے کہ عبادت گاہ ہر دار الاقامہ میں سب کے لئے ایک ہی ہو اور اُس میں مختلف مذاہب وملت کے اصحاب اس طرح اپنی عبادت ادا کریں کہ جو دوسرے کے لئے باعث اشتعال نہ ہو جس طرح سے کہ پہلے سے ہوتا آیا ہے۔ جن مذاہب اور ملت کے لوگ پہلے کالج میں آتے تھے۔ اُنھیں کے افراد اب آتے ہیں پھر اُس میں جدتیں پیدا کرنا اور نئے نئے حقوق طلب کرنا یا قائم کرنا کونسی عقلمندی ہے۔ اگر جدید پالیسی اختیار کی گئی تو وہ دن عنقریب ہوگا کہ کالج مذہبی مناقشات اور جنگ وجدال کا مخزن بن جائے گا۔ یہ کالج

اس لئے نہیں ہے کہ مختلف مذہب و ملت کے علما یہاں اپنی اپنی پالیسی کا رنگ چڑھائیں اور اپنے اپنے نقطۂ خیال پر مختلف افراد کالج کو چلائیں۔ بلکہ مذہبی تعلیم بس اسی قدر ہو کہ کالج کے اوقات کے علاوہ ہر ملت و مذہب کا ایک عالم اپنے اپنے نصاب کی جداگانہ تعلیم دے اور ہر دار الاقامہ میں نماز کی پابندی ہو لیکن علیحدہ علیحدہ معابد گاہوں میں نہیں بلکہ ایک ہی عبادت گاہ میں بس اس پابندی کے ساتھ کہ وہ کسی نوع پر دوسرے کے لئے باعث اشتعال نہ ہو۔ موجودہ مقرر کردہ اماموں سے بہتر خود اکثر طلباء کالج امامت کے فرض کو بہ حسن وجوہ ادا کر سکتے ہیں۔ نصاب البتہ تبدیلی چاہتا ہے۔ کیونکہ پرانا نصاب موجودہ ضروریات کے لحاظ سے موزوں نہیں ہے۔ انہیں خطرات کی بناء پر سید مرحوم نے علماء کو کالج کی اندرونی پالیسی میں مداخلت دینے سے احترازی پالیسی کو اختیار کیا تھا۔ لیکن وائے بر ما کہ ہم اُس سے دور ہوتے جاتے ہیں +

اخلاق کے صحیح معنوں میں کالج کی اخلاقی حیثیت بہت ہی گری ہوئی نظر آتی ہے۔ پرانے طرز کے لوگوں کا مذاق بنانا مذہب پر چھینٹے اُڑانا اور اپنے جلسوں میں اُس قسم کی گفتگو کرنا کہ جو ہر مہذب قوم اور بالخصوص مسلمانوں کے سنہرے زمانے کی اخلاقی روایات کے خلاف ہے نئی روشنی کے دلدادوں کے طرز عمل میں داخل ہو گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ تعلیم یافتہ جو متموّل نہیں ہیں کسی اعلےٰ عہدے پر ممتاز نہیں ہیں۔ اعلےٰ درجے کا سوٹ استعمال نہیں کرتے معاشرت میں یورپ کی اندھی تقلید نہیں کرتے خواہ وہ اسی مادرِ کالج کے سپوت کیوں نہ ہوں اِن تعلیم یافتوں میں اُن سے ملنا اور خلا ملا رکھنا کسرِ شان سمجھا جاتا ہے۔ اُن کو اپنے جلسوں میں بلانا ان کے لئے عار ہے۔ اُن کو اپنے جلسوں میں مساوات کے درجہ پر رکھنا ننگ ہے کھُلی آنکھوں دیکھیئے

ہوئے کہ باہر نکلکر بھی تعلیم یافتیاں علیگڈھ میں بے اصولی اندرون کالج کی پارٹی کا اثر باقی رہتا ہے کسقدر صدمہ ہوتا ہے! اندرون کالج کی پارٹیاں جو اختلاف رکھتی ہیں وہ وہیں کے شغل کیلئے اور اُسی چہار دیواری کے اندر محدود ہیں پھر کالج سے باہر آکر انہیں اصولوں پر ایک دوسرے سے مخالفت کرنا اور ایکدوسرے سے چشمک رکھنا اور میل وملت کو نہ بڑھانا کونسی روشن ضمیری اور کونسی مہذب قوم کی تقلید ہے کسی سیاسی معاشرتی اخلاقی اصول پر اگر اختلاف ہو تو حق بجانب ہے۔ مگر اس اصول پر اختلاف کرنا کہ بہ زمانہ کالج میں دوسری پارٹی کا ممبر تھا کسقدر شرمناک ہے۔ اسکے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ افراد کالج میں اسقدر نفس پرستی اور خود غرضی پھیلی ہوئی ہے کہ جسکو خدا ہی دور کریگا تو دور ہوگی اس قسم کے اختلاف نہ صرف طلباء کالج تک محدود ہیں بلکہ اراکین کالج بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہندی مسلمانوں کو اپنی توہین و ذلت پر حرارت نہ آنے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ زیور علم سے مزین نہیں ہیں بلکہ اسکی سب سے بڑی وجہ اُن کے اخلاق کا خراب ہوجانا ہے گنواروں کی ٹکڑی اور بھٹیار خانے کے ممبروں میں جو تو تو میں میں ہوتی ہے اور جو ایکدوسرے کو سوائے دشنام دینے کے کچھ نہیں کرتے جو مخرب اخلاق اور بھکڑ بکنے کے عادی ہوتے ہیں انہیں اور آجکل کی تعلیم یافتہ پارٹی میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ ننگے ہیں اور ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ورنہ حقیقت میں یک سِمہ بھی اخلاق میں ترقی نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے مغربی رہنماؤں میں اکثر ایسی باتیں مروج ہیں کہ جو ہمارے تہذیبی اصولوں کی کسوٹی پر مخرب اخلاق نکلتے ہیں اور انہیں کا چربہ ہم اتارتے ہیں لیکن اُنکے یہاں کبھی سوسائٹی میں وہ نقص نہیں ہیں کہ جو ہمارے یہاں کی سوسائٹیوں میں پیدا ہوگئے ہیں۔ علوم قدیم سے کسی اصول پر اختلاف کرنا اور قدیم تہذیب کے راستہ کو راہ راست نہ پاکر دوسرا راستہ اختیار کرنا کوئی عیب نہیں ہے لیکن پرانی قطع اور وضع کے لوگوں کا اُن کے منہ پر یا خیال کسی تہذیب اور تعلق کے مضحکہ اُڑانا پھبتی کہنا۔ آوازے کسنا اور اُن کی وقعت اپنی نگاہوں میں کم کردینا کونسی

تہذیب اور اخلاق ہے۔ اِس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ دیسی مکاتب یا عربی مدرسوں کی تعلیم کا اخلاق پر مقابلتاً کوئی بہت اچھا اثر ہے۔ بلکہ اُن کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہم جو چراغِ ہدایت دکھانے کا دعوے کرتے ہیں اور نور ہدایت کو لئے ہوئے دنیا کو نئی روشنی سے منور کرنے اور ترقی میں آگے قدم بڑھانے کے داعی ہیں ہم کونسی انوکھی بات کی سند رکھتے ہیں۔ موجودہ طالب علم ہوں یا پُرانے طالب علم آپ اُن کی صحبت و مجالس میں مذاکرات علمیہ کا تذکرہ بہت ہی کم پائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان فرشتہ نہیں بن سکتا اور نہ ہر شخص جامۂ تقدس سے ملبوس ہوسکتا ہے اور نہ ہونے کی ضرورت لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ معمولی قوانین و تہذیب و اخلاق کو بھی اُن کی صحبت میں دخل نہ ہو۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

مختصراً میں یہ کہوں گا کہ "این آزادگی نیست بلکہ آوارگیست"۔ رہی قومی حیثیت کی ترقی اُس کے بیان کی کیا حاجت ہے۔ کیونکہ آج کل قومی روح جس میں پائی جاتی ہے اُس کو باغیانہ خیالات سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ یا سیاسی رنگ اُس پر چڑھا دیا جاتا ہے اور اسی لئے علیگڈھ کالج کے تو پروگرام ہی سے یہ حیثیت باہر ہے۔ یہاں کے منتظمین اور اراکین اِس امر کو سخت ناپسند کرتے ہیں کہ یہاں کے نوجوانوں میں قومی احساس پیدا ہو۔ بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہاں تو اُن پر مختلف علوم و فنون کی کتابیں لادی جائیں اور یہ امر کہ وہ کتابیں کیا سکھلاتی ہیں اور کس مصرف کی ہیں وہ کالج سے نکلکر باہر معلوم کریں۔ اِس امر میں کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ عملی طور پر سیاسیات میں طالبعلموں کا حصہ لینا نہ صرف مضر تسلیم ہے بلکہ اُس کی بالکل یہی مثال ہے کہ وہ بچہ جو اچھی طرح پیروں چلنا نہ جانتا ہو وہ دوڑ میں شریک ہونے کی کوشش کرے۔ بلاشبہ

طالب علموں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے کھلی آنکھوں سے کچھ عرصہ واقعات کو دیکھیں اُس کے بعد ایک زمانے تک اُن کا علم حاصل کریں اور پھر کچھ عرصہ اُن پر رائے قائم کرنے اور غور کرنے میں دماغ سوزی سے کام لیں۔ اور عمل کے میدان میں اُتریں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ علیگڈھ کالج میں پہلے دو درجوں پر ہی عمل پیرا ہونا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں یا تو کوئی کسی امر پر غور نہیں کرتا اور اگر عملی طور پر کچھ کرتا ہے تو وہ بادلے کی سی بڑ ہوتی ہے کہ جس کا سر ہوتا ہے نہ پیر۔ نہ اِس سے غرض کہ وہ مفید ہے یا مضر۔ نہ اِس سے مطلب کہ اُس کا نتیجہ سودمند ہوگا کہ تخریب کرنے والا۔ بہرصورت کالج میں وہ قومی حیثیت کہ جس کی امید کی جاتی تھی اور جس کی طرف مسلمانوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں مفقود نظر آتی ہے اراکین کالج پر صد آفریں ہے کہ وہ اُس کے بانی اور مسلمانوں کے قومی مقصد کی منشار کو خوب سمجھے :-

تیسری حالت کے جانچنے کے لئے یہ دیکھنا ہے کہ کالج سے نکلے ہوئے کتنے بالغ العلوم اور کامل العلوم نے مسائل عامہ پر غور کیا ہے اور ملک کے فائدہ کے لئے کون کون سی نادر تجاویز اُنھوں نے گورمنٹ اور پبلک کے سامنے پیش کی ہیں اور فلاح ملک کے لئے کون کون سی صورتیں اختیار کی ہیں۔ ملک میں کتنی مفید سوسائٹیاں یا کلب اُن کے ہاتھوں قائم ہو چکے ہیں کتنی کتابیں مسائل عامہ اور سیاست پر اُن کے قلم سے نکل چکی ہیں اور کتنے مطابع اور اخبار اور رسالے ہندوستان میں اُن کے ہاتھوں یا اُن کی اعانت سے خواہ وہ درمی ہو یا قلمی چل رہے ہیں۔ اِس کا جواب علم الاعداد کے حساب سے بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ لیکن اِس حیثیت کے بہتر کرنے میں جوڑی کا ایک ہی رہوار کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ حاکم و محکوم دونوں کے لئے کچھ ہو سکتا ہے

دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے تالی اکبرؔ
ہم اکیلے ہی محبت کو نباہیں کیونکر

ہند کے حاکم و محکوم مختلف المذاہب معاشرت تمدن کے افراد ہیں۔ اُن میں آپس میں اُس وقت تک اتحاد ممکن نہیں کہ جب تک دونوں ایک دوسرے کے مزاج واقعات اور روایات کے سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اور رسوا نقاذ طریقہ پر غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یوروپین اسٹاف اور اراکین کالج و طلبا کالج میں بھی اتحاد کی اگر صورت ہے تو یہی ایک صورت ہے۔ کالج کی یہ حالت کن وجوہ سے ہوئی اور اُس کے کیا اسباب ہوتے ہیں نفس کتاب میں دکھا چکا ہوں اور جب تک کہ ٹرسٹیوں کے انتخاب کا طریقہ اور کالج اسٹاف میں ناموزوں اصول تقرر میں تبدیلی نہیں ہوگی اُس وقت تک کالج ترقی میں ایک قدم نہیں چل سکتا بلکہ رجعت قہقری کرتا رہے گا۔

اِس امر سے کسی کو اختلاف نہیں کہ کالج ہی وہ دارالعلوم ہے کہ جس پر مسلمانوں کی نگاہ پڑتی ہے۔ کہ جہاں سے مسلمانانِ ہند کی ترقی کا آفتاب طلوع ہو کر چمکے گا۔ اُس کے اعلیٰ کام کا اعتراف ہر قلب میں نقش کالحجر کی طرح جاگزیں ہے لیکن ساتھ ہی اِس کے اگر اُس میں کوئی کمی نظر آتی ہے تو طبیعت میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اِس قسم کی نکتہ چینیوں کے لئے اراکین کالج طیار رہیں اور اُس میں جو نقائص ہوں اُن کے دور کرنے میں ساعی ہوں۔ جو کچھ میں نے رطب دیابس لکھا ہے۔ وہ ایک ہی خواہانہ نکتہ چینی ہے۔ ایک زمانے سے یہ خیال تھا۔ کہ کالج کے کچھ حالات قلمبند کروں۔ لیکن اس کا موقع نہ ملتا تھا چند احباب کے اصرار سے اس کام کو شروع کیا اور جو کچھ لکھ سکا وہ بیش نظر ہے میرا حال غالب مرحوم کے اِس شعر کے مصداق ہے۔ ؎

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں مجُھے

جو فرو گذاشت اِس میں ہوئی ہے اُس کو اہلِ نظر معاف کریں گے۔ خدا کرے کہ کالج ایک اعلیٰ پیمانہ پر پہنچکر جو پہلے چمکتا ہوا ستارہ نظر آتا تھا۔ آئندہ اُفق مشرق میں آفتاب ہوکر چمکے اور مشرق و مغرب دونوں اُس کی پرنُور شعاعوں سے یکساں مستفید ہوں ؞

این دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد بدرالدین

دنیا میں جن چیزوں پر ہر قوم و ملت کا یکساں اعتقاد تھا اون میں سے ایک جادو بھی ہے۔ یورپ جو آج مہذّب ملکوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے صدیوں تک اس توہم پرستی کی آفت میں مبتلا رہ چکا ہے۔ ہندوستان میں تو ابتک اس قسم کے عقائد کا اثر چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بچپن میں انّا دِدّا سے قصّے کہانیوں میں جادو کا نام سنتے سنتے کچھ ایسا جادو کا خیال بندھا کہ بڑے ہوکر یہ فکر ہوئی کہ اس کی اصلیت کو معلوم کیا جائے۔ ہندوستان میں سحرِ بنگالہ کی دھوم تھی۔ مگر جب سے اہلِ فرنگ نے اپنے جادو کا وار کیا نئے تعلیم یافتوں کے گروہ نے فرنگیوں کے علم فسوں ساز کو پڑھکر سحرِ ہند کو ایک بادِ ہوائی کی طرح دلوں سے محو کردیا۔ علوم جدید کی بجلی نے سحرِ قدیم کے خرمن پر وہ بجلی گرائی کہ وہ ایک راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ رہا اور وہ صرف ایک خواب و خیال ہوکر رہ گیا۔

سحرِ فرنگ کی تعلیم میں سترہ برس کی عمر ہونے آئی تھی کہ یکایک ایک آواز آئی کہ دلّی کے ایک سید نے فرنگی سحر پر کچھ ایسا رنگ چڑھایا ہے کہ جوق کے جوق لوگ قصبہ اور قریہ۔ صوبہ اور ممالک سے اوس کی درسگاہ سحر آموزی کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ سنا تھا کہ سرکاری جادوگھر سے نکلکر بغرض تحصیل و تحقیق کے لئے اس نئے طلسم ہوشربا میں داخلہ کے لئے روانہ ہوا

اسٹیشن کول سے گاڑی پر اسباب رکھ کوچبان سے کہا کہ مجھے سیّد والے جادوگھر پہونچادے۔
دس منٹ کی مسافت کے بعد ایک سُرخ حصار قدِ آدم نظر آئی کہ جسپر جابجا اُن جادوگروں
کے نام کندہ تھے کہ جنھوں نے اس حصار کے بنانے میں مدد کی تھی۔ ایک چھوٹا کمرہ دروازہ
کے قریب محافظ سٹرک کا بنا ہوا تھا۔ لیکن حصار کے اندر داخل ہونے میں کسی روک ٹوک یا پوچھ
گچھ کا قاعدہ نہ تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گاڑی سٹرسے اندر ہوئی تو میں نے اپنے کو ایک سٹرک پر دیکھا
کہ جہاں دو طرفہ درخت اس طرح ایستادہ تھے کہ گویا ساحران سبز پوش کی فوج تبدیل ہیئت کئے
ہوئے گنبد احمر کی حفاظت میں صف بستہ ہے۔ یہیں سے ایک حصار سُرخ پتھر کی نمودار ہوئی
کہ جسکے ہر ایک کمرہ کے دروازہ کی جانب سیاہ سیاہ آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اور جگہہ جگہہ
نوجوان ساحروں کی ٹکریاں بیٹھی ہوئیں کاغذوں پر زائچہ کھینچے محو حیرت بنی ہوئی تھیں۔ دل کا یہ
عالم تھا کہ بلیوں اوچھل رہا تھا۔ میں ابھی اسی حالت فکر میں تھا کہ دیکھئے آئندہ اس نئی زندگی میں
کیا واقعات پیش آئیں کہ ایک عظیم الشان دروازہ کہ جس میں دو کواڑ چوبی جابجا لوہے کی پچہ کاری
سے مرصع لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ جیسے دو قوی ہیکل دیو زرہ بکتر پہنے خاموش
پہرہ دیتے ہوں۔ نظر آیا۔ کوچبان نے کہا کہ حضرت اُترئیے۔ بندہ آگے قدم نہیں رکھ سکتا۔

اگر یکسر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہہ کر اور ایک صد سالہ سفید ریش کوزہ پشت دربان سے دریافت کرکے
اسباب اُٹھوا ساحر بجنوری کے کہ جنھیں میں پہلے سے واقف تھا کمرہ پر چلا۔ ایک عجیب منظر پیش نظر
تھا۔ ایک گنبدی مرتفع شاندار عمارت سے لیکر ایک چھوٹی مگر خوشنما عمارت تک طلسم ہوشربا کے
سُرخ سُرخ کمرے ایک سلسلہ کے ساتھ ایک مستطیل کی شکل بناتے ہوئے۔ بنے ہوئے تھے
قلب میں ایک نہایت شاندار بلند عمارت کہ جو اردگرد کے منظر پر اپنا رعب قائم کئے ہوئے تھی اور
جسکے دہنے اور بائیں جانب دو گیلریاں اسطرح معلوم ہوتی تھیں کہ جسطرح دو محافظ بدن شاہی

کی حفاظت میں خاموش ایستادہ ہوں ۔ شاہجہانی رنگ میں ملبوس بنی ہوئی تھی ۔ آنکھیں تصویر
حیرت بنی ہوئی تھیں ۔ اور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ یکایک شور ہوا کہ یہ ملا نا دقیانوسی فنش کا
حصار طلسم ہوشربا بن سے ایک سنان بینی و ایک انچی داڑھی کے کیسے وارد ہوا ہے ۔ ذرا بلانا
ساحر صفا چٹ خاں کو وہ اس کو گرفتار طلسم کی دستور کے موافق خبر لے ۔ یہ سنکر دل کانپ گیا ۔ ایک
لمحہ گذرا تھا کہ ساحر صفا چٹ خاں کمر باندھے ہتھیار لگائے کیل کانٹے سے درست ایک آن
کی آن میں خدا معلوم زمین سے یا آسمان سے آموجود ہوا ۔ اور بڑھے ہوئے پانی کو کو بنجر سحری
پر لگا کر جو پتھر طلسم پر گرا تو یکایک جھاگ اوٹھ کھڑے ہوئے میں ہائیں ہائیں کرتا رہ گیا ۔ کہ ایک
دو نے گردن اور دو چار نے ہاتھ پیر پکڑ داڑھی کا صفایا کر دیا ۔ میں تو سمجھا تھا کہ ناک بھی گئی ۔ مگر
ہاتھ پھیر کر دیکھا تو وہ چہرہ پر سلامت تھی ۔ اس یکایک انقلاب سے متاثر ہوکر مجھ پر ایک حالت
تحیر طاری ہوئی ۔ بارے جب دو چار گھڑی بعد تار تخیل ٹوٹا اور دو چار بڑا نے ساحروں نے ایک
جدید طرز کا لکچر کہ جس سے کان اب تک آشنا نہ تھے تبدیل ہیئت کی ذم جیبت پر دیا تب چار و ناچار
ڈرتے ڈرتے کمرہ سے باہر نکلا ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ کچھ ساحر سامنے کے سبزہ زار پر سفید سفید
گیندے ایک جال پر کود پھاند میں مشغول ہیں ۔ اور غزالان دشت کا چربہ اوتار رہے ہیں ۔ کچھ
ایک میز پر انڈے نما چیز سے چھوٹے سے جال پر بمبزا ابن کر رہے ہیں ۔ حیرت اسپر تھی کہ جب یہ
انڈے نما چیز پھینک جاتی تھی تو ساحر لیمپ کی چمنی کی گرمی سے اوسے پھر اپنی اصلی حالت پر لے
آتے تھے ۔ انہیں سے کچھ ایک چھڑے کے ترازو جیسی چیز کو ٹھوکروں سے ہوا میں اوڑا رہے تھے
اور کچھ گوئے سحری کو پھینک پھینک کر ہوائی کھیل کھیل رہے تھے ۔ یہ وہ تماشے تھے کہ نہ آنکھ سے
دیکھے تھے اور نہ کان سے سُنے ۔

شام ہوئی تو روحانی جرس کی آواز سنتے ہی جوق کے جوق ساحران فسوں ساز اس گنبدی عمارت
میں جمع ہوئے کہ جہاں اونکو بھی اپنی عبدیت کا ثبوت دینے کے لئے پنجگانہ اپنے معبود کے سامنے سر نیاز
جھکانا ہوتا تھا ۔ یہ عمارت مغلیہ خاندان کے مشہور تاجدار شاہجہاں کی عمارت کے نمونہ کی ساختہ ہے

اور اوسی کے مرغوب رنگ سرخ میں وہ ملبوس ہے کہ جو رنگ اس طلسم ہوش ربا کے بانی
کو پسند تھا ادائے فرائض روحانی کے بعد ایک اور جرس کے بجتے ہی گروہ کے گروہ ساحر ایک
وسیع تالار اخگر میں داخل ہوئے اور وہاں کھانا پکر کچھ تو کمروں کی طرف اور کچھ ایک اور زرد
رنگ عمارت کی جانب روانہ ہوئے۔ اس عمارت میں اسوقت کا رنگ اپنی انداز میں نرالا تھا
کہیں گنجفہ تھا تو کہیں چوسر۔ کہیں تاش تو کہیں رنگو۔ کہیں اخبار تو کہیں کتب سحر۔
غرضکہ ٹکڑیاں تقسیم ہو کر اپنے اپنے رنگ میں کمال دکھانے میں مشغول ہوئیں۔ رات زیادہ
آئی تھی اس لیے کمرہ پر واپس آکر میں تو بھر فکر میں غوطہ لگاتے ہی عالم شال کی سیر میں مصروف ہوا
صبح ہوتے ہی ساحر بجنوری نے کہا کہ اگر سحر فرنگ کے اچھا سمندر میں غواصی سیکھنا ہے تو چلیے
زمرہ ساحران میں داخل ہوجئے۔ آیا تو اسی لیے تھا۔ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سب سے پہلے **اسود دیو**
کے سامنے پیش ہوا۔ طلسم دار الاقامت کے یہ سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ دبلے پتلے۔ سر سیاہ
دندان سفید۔ منہ پر کیا انگشت۔ دو دست سیاہ داڑھی۔ چہرہ سحر فرنگ کی گو بیوں سے مثل غربال
چھلنی۔ زبان۔ ریگستانی۔ مگر ہندوستانی۔ اس دیو نے بلا رد و قدح حجرہ ٹھہرا میں جگہ دی
کچھ زر نقد بطور ضمانت جمع کرا کر مہینہ بھر کا خرچہ وصول کر دو پرزے لکھ دیے اور ہدایت کی
کہ امنیں سے ایک **دیو سفید** کو دے دیا اور دوسرا داروغہ طلسم دار الاقامہ کو۔ دیو سفید
کے سامنے جانے کا اس سے پہلے کبھی اتفاق ہوا تھا۔ دروازہ پر خبر کی کہ ایک نو گرفتار
طلسم آیا ہے۔ اور طلسم ہوشربا میں داخلہ کا طلبگار ہے۔ پہلے تو سوائے "ٹھیرو" کے
کچھ جواب نہ ملا۔ ایک جم غفیر داخلے کے لیے کھڑا تھا۔ بارے ایک مدت کے بعد نمبر آیا۔ داخل
ہوتے ہی فرشی سلام کیا۔ جواب میں سر ہلا۔ اور پرزہ ہاتھ سے لیلیا۔ اسکو پڑھکر ایک چوب
سرخ سے زبان سحر مشحون سازیتن "منظوری" کا لفظ لکھ دیا۔ اور **اسود جادوگر** کے
پاس جانے کا حکم ہوا۔ یہاں بیسیوں رجسٹروں میں نام لکھا گیا۔ اور اس کے بعد ایک پرزہ
داروغہ طلسم دار الاقامہ کو ملا۔ یہاں پہونچکر کمرہ میں جگہ ملی اور قواعد طلسم ہوش ربا کے اندر رہنے

اور باہر جانے وغیرہ کی ایک کتاب دی گئی ۔ اب ساحروں میں نام لکھ گیا ۔ اور ادھر اُدھر پھرنے کی آزادی ملی ۔ اور اب ساحر بجنوری نے چند اور ساحروں سے تعارف کرایا ۔ جن میں سے **ساحر بنگالہ** خاص طور پر قابل ذکر ہیں اونکی آمد کی علامات کو محسوس کر کے ساحر بجنوری نے کہا کہ ساحر بنگالہ آتے ہیں ۔ اُن سے ملئے ۔ اور میل و ملت بڑھائیے ۔ اگر وہ تم کو اپنے ساتھ رکھیں گے تو سحر کے بعض شعبوں میں طاق کر دینگے ۔ یہ طلسم ہوشربا کے ادنیٰ اور اعلیٰ سیاسی بارود کے مخزن اور تخت سلیمانی کے ایک زبردست رکن ہیں ۔ یکایک ایک زلزلہ سا سارے میدان میں محسوس ہوا ۔ سیاہ سیاہ بادلوں سے آسمان گھر گیا ۔ ادھر تاریکی کا زور اُدھر بجلی کا شور ۔ ہوا سائیں سائیں کرنے لگی ۔ اور دل میں تھرتھری پیدا ہو گئی ۔ اتنے میں سیاہی دور ہوئی ۔ ہوا رک گئی ۔ بجلی اِدھر سے آئی اُدھر گئی ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مجسم صورت سر سے پیر تک گول نہ ادھر کونہ باہر نہ اُدھر آنکھیں خون کبوتر جیسی سرخ دہکتی ہوئی ۔ انتہا افق کے دیکھنے کے لئے دوربین عینک آنکھوں پر چڑھی ۔ منہ سے دھواں جاری ۔ عضو عضو پھڑکتا ہوا ۔ شرارت کے زہر کے بجھے ہوئے تیر نظر میں ۔ حال دیکھتے ہی صورت دل دھک سے ہو گیا ۔ ابھی **ساحر بنگالہ** کے نظارہ ہی سے چھٹکارہ نہ ہوا تھا کہ دوسری جانب سے ایک چھریرہ بدن گندمی رنگ ۔ ساحران فرنگ کی وردی پہنے عینک ناک کے اسٹینڈ پر رکھے ڈاک انجن کی طرح چلے آتے ہیں ۔ ساحر بجنوری نے اشارہ کیا کہ یہ پوربی ساحر ہیں ۔ انھوں نے اگرچہ ابھی اعلیٰ طبقات سحر میں داخلہ کا اجازہ نہیں لیا ہے ۔ لیکن پھر بھی اس طلسم ہوش ربا کے ایک بڑے ہونہار اور گرگ باران دیدہ ساحر ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناک تو اس ساحر پوربی کی ایک ہی تھی ۔ مگر یہ وصف انہی ساحر میں تھا کہ طلسم ہوش ربا کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا کہ جسکے سوراخوں میں آپ کی ناک نہ ہو ۔ انکی ملاقات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ۔ کہیں پنجابی ساحر دلسوز ٹھیٹھ ہوئی تو کہیں دیسی ۔ کہیں پوربی ۔ تو کہیں مدراسی ۔ کہیں بنگالی ۔ تو کہیں بمبئی ۔ غرض کہ اب طلسم ہوش ربا تھی اور میں تھا ۔ کوئی شعبہ نہ تھا

اور کوئی مجلس اور کرشمہ نہ تھا کہ میں نے وہاں نہ دیکھا ہو۔

باب دُوم

پہلی جھلک

اس علمی جادوگھر کا رنگ ہندوستان میں تو کیا تمام ممالک ایشیا میں نرالا ہے۔ یہ درسگاہ اقامتی اصول پر بنائی گئی ہے جسکے یہ معنے ہیں کہ درسگاہ کے متعلق اسقدر دارالاقامے بنائے جائیں کہ تقریباً کل متعلم ساحران دارالاقاموں میں بزیر نگرانی ساحران معلم کے تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ یہ اصول سب سے پہلے ہندوستان میں سید مرحوم کے دماغ میں پیدا ہوا اور اسی اصول پر اُس نے اس جادوگھر کی بنا ڈالی۔ ایک زمانہ سے یہ غلغلہ چلا آتا تھا کہ مسلمانان ہند جدید تعلیم کی دوڑ میں دیگر اقوام ہند سے پیچھے ہیں۔ اور سلطنت کے چلے جانے سے وہ ایک مردہ قوم میں شمار ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ اس مردہ اور بیمار قوم کی موجودہ اور آیندہ نسلوں میں ایک روح قومی پھونکنے کے لئے یہ مشینری تیار کی گئی۔

ہندی مسلمانوں کی اس جہالت اور نکبت کو دیکھکر سب سے پہلے اُس کا خیال ہوا کہ مغربی علوم کی مختلف شاخوں کے فنون سائنس علم کی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ کرا کر مشتہر کیجائیں اور جہانتک ممکن ہو سکے دیسی مکاتب کے نصاب تعلیم میں وہ شامل کیجائیں۔ چنانچہ اس غرض کے پورا کرنے کے لئے ایک علمی جماعت ترجمہ کرنے کی قایم کی۔ جسکا نام سائنٹفک سوسائیٹی رکھا گیا۔ جسکا پہلا اجلاس نویں جنوری ۱۸۶۴ء کو بمقام غازی پور جہاں کہ وہ صدرالصدور تھے منعقد ہوا جسمیں اُس نے اس علمی جماعت کے اغراض و مقاصد کو بالفاظ ذیل ظاہر کیا۔

"جب میں اپنے پیارے ہموطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گذشتہ حالات سے اسقدر ناواقف ہیں کہ آیندہ رستہ چلنے کو اُن کے پاس کچھ بھی روشنی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا۔ اور آج کیا ہے۔

اور اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔ وہ نہیں جانتے کہ دنیا میں
جو بہت چھوٹی چھوٹی قومیں تھیں انھوں نے کیونکر ترقی پائی۔ اور کس طرح وہ ایک
بڑے شاندار اور سایہ دار درخت کی مانند ہو گئیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جو بڑی
بڑی قومیں ایک بڑے میوہ دار درخت کے مانند پھل پھول رہی تھیں ۔ وہ
کیوں کر مرجھا کر سوکھ گئیں۔ "

ان الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اولاً سرسید کا خیال مسلمانان ہند میں اس امر کو جاگزین کر
دیا تھا کہ قوموں کے عروج و زوال کے کیا اسباب ہیں۔ اور ایک قوم کس طرح اپنے آپ کو
دوسروں کے مقابلہ میں معزز اور موقر بنا سکتی ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں نہ تو تعلیم انگریزی
عام ہو سکتی تھی۔ اور نہ مسلمان اس کی طرف متوجہ تھے۔ لہذا اونھیں کی دیسی زبان میں
علوم مغربی کے جواہر ان کے سامنے پیش کرنے کے لئے یہ علمی جماعت ترجمے کی قائم
کی۔ لیکن ایک تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اوسے یہ معلوم ہوا کہ ان پیروں مسلمانان ہند کی ترقی
کی گاڑی چلنے والی نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے چند ہمدرد اور سربرآوردہ لوگوں کی معیت میں ۱۸۷۵ء
میں دارالعلوم علیگڈھ کا سنگ بنیاد نصب کیا تاکہ آیندہ نسلیں اس جادو بھری تعلیم گاہ
سے نکلکر خود اپنے گھروں کو جدید ترقی کے سیلاب سے محفوظ رکھیں بلکہ ملک و قوم کو ہلاکت
سے بچائیں۔

سرسید چونکہ حکومت شخصی کے خلاف اور اصول جمہوریت کے سختی کے ساتھ مؤید تھے
اس لئے اونھوں نے کالج کی سلطنت کی باگ وسعت کی ترقی کے ساتھ ایک امینوں
کی جماعت کے ہاتھ میں دی۔ اور مصلحت زمانہ و بہ اقتضائے وقت امینوں کو تاحین حیات
اس عہدے پر قائم رہنے کا منصب عطا کر کے خود اس جماعت کا سکرٹری ہونا قبول
کیا۔ اگرچہ زمانہ قیام درسگاہ کے لئے یہ برا قانون نہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ مسلم طور پر مانا جا
چکا ہے کہ قانون کو تغیرات عالم اور ضروریات زمانہ کا ساتھ دیتا رہنا چاہئے۔ اس لئے موجودہ

قانون اُمنائے کالج زمانہ حال کے موافق نہیں ہے۔ لیکن ہمارے محترم بزرگ وہی تقلیدی غلطی کیوجہ سے کہ جس غلطی کے دور کرنے کے لیئے اونھوں نے چراغ ہدایت کو مغربی علوم سے روشن کیا ہے۔ اسی قانون کی لکیر کے فقیر چلے جاتے ہیں۔ اور قوانین امنائے کالج میں کسی ترمیم ہونے کے مانع اور مخالف ہیں۔ اس وسیع اور شاندار دارالعلوم کے حالات قلمبند کرنے کے لیئے اُس کے مختلف شعبوں کا مختلف حیثیتوں سے فرداً فرداً تذکرہ کرنا لازم ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں دارالاقاموں سے شروع کرتا ہوں۔

باب سوم

دارالاقامہ

ادنے اور اعلےٰ تعلیم کے ساحروں کے لئے یہاں جداگانہ متعدد دارالاقامے ہیں۔ ڈبی ہنجر[۱]۔ ظہور وارڈ[۲]۔ میکڈانل ہاؤس[۳]۔ ممتاز ہاؤس[۴]۔ انگلش ہاؤس[۵]۔ ابتدائی تعلیم کے ساحروں کے لئے ہیں۔ انہیں سے ظہور وارڈ میں وہ طلبا رہتے ہیں کہ جو مادر کالج کے شیر خوار بچے کہلاتے ہیں۔ جب وہ سِن شعور کو پہنچتے ہیں تو متذکرہ بالا دیگر دارالاقاموں میں منتقل کردئے جاتے ہیں۔ آخرالذکر انگلش ہاؤس اون طلباء کے لئے مخصوص ہے کہ جو اعلےٰ تعلیم کے لئے انگلستان جانے سے قبل ہندوستان ہی میں اپنے آپ کو وہاں کی طرز معاشرت کا عادی بنانا چاہتے ہیں۔

اعلےٰ تعلیم کے ساحران کے لئے سرسید کورٹ[۱] (پکی بارک) سید محمود کورٹ[۲] (کچی بارک) نئی بارک[۳]۔ انٹو سرکل[۴]۔ سوسائٹی ہاؤس[۵]۔ صاحب باغ[۶] مختص ہیں۔

سرسید کورٹ یہ ایک پختہ عمارت سنگ رخام اور بڑی سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ ایک ہال اور اُس کے پیچھے ایک چھوٹا کمرہ معہ غسلخانے کے ایک کمرہ کہلایا جاتا ہے

اور اس میں پہلے دو طلباء کے رہنے کی اجازت تھی اب تین کی ہے۔ ہال کے سامنے ایک وسیع برآمدہ ہے اور چھوٹے کمرے کے پیچھے ایک دروازہ ہے کہ جس میں لوہے کی شاخیں لگی ہوئی ہیں۔ صحن میں کچھ جگہ چھوڑ کر تینوں کے درمیان گاتھک طرز کے پاخانے بنے ہوئے ہیں۔ جن کو اول مرتبہ دیکھنے میں ناواقف اصحاب ہرگز نہیں پہچان سکتے کہ یہ پاخانے ہیں۔

اس بارک کے رہنے والوں کی خاص خصوصیات ہیں۔ اوّل یہ کہ مالدار ہو۔ اگر مالدار نہ ہو تو مالداروں کی طرح رہتا ہو۔ بے فکر ہو۔ پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہ ہو۔ کالج کے دیگر اشغال میں معتدبہ حصہ لیتا ہو۔ پلیئر ہو۔ یا لوفر۔ رائیلسٹ ہو یا کالج میں نئی نئی شرارتیں تجویز و عمل کرنے کا ماہر ہو۔ مغربی طرز کا دلدادہ ہو۔ بانکا اور ترچھا ہو۔ اور دنیا کے سب شعبوں پر گفتگو کر سکتا ہو۔ چاہے اوس کے متعلق علمی واقفیت بہت ہی کم ہو۔ لیکن یہ نتیجہ الاکثر وحکم الکل کی بنا پر نکالا گیا ہے۔ ورنہ کچھ ایسے بھی لوگ اس بارک میں ہمیشہ رہتے آئے ہیں کہ جو قابل۔ سنجیدہ اور علم کے شائق ہوتے ہیں۔ کالج کے اشغال تفننی میں اگرچہ شریک ہوتے ہیں۔ لیکن اعتدال کے ساتھ۔ غرضکہ میں جب یہاں پہونچا تھا تو یہ مہران رائیلسٹ کا لچا اور ماوا تھا۔ اور اودھم مچانے کا مخزن۔

کچی بارک اور نئی بارک

یہ عمارات اک قسم کی عمارات ہیں جن کی چھت کھپریل کی ہے۔ اگر جا کر دیکھیں تو آپ کو دقیانوسی پولیس بارک کا شبہ ہو گا۔ ان میں ایک ہی بڑا کمرہ ہوتا ہے۔ اور اس بڑے کمرے میں ایک جانب غسل خانہ ہے۔ دو آدمیوں کے رہنے کی ہر ایک کمرے میں اجازت ہے۔ اس بارک میں سجاوٹ کا قاعدہ عام نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں آپ کمروں کو سجا ہوا پائیں گے۔ برخلاف اس کے پکی بارک کے کمرے ہر طرح آراستہ ہوتے ہیں۔ اس میں رہنے والوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ درٹو وٹیذ ہو۔ امیر ہو یا غریب لیکن رہائش میں بے پرواہ ہو۔ پلیئین پارٹی کا زبردست

رکن ہو۔ اشغال تفننی اور کھیل میں یہ بھی بی بارک سے کچھ کم نہیں ہے۔ جس زمانے کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اوس وقت یہی مشہور تھا کہ اگر پڑھنا ہو تو بی بارک میں رہنا چاہیئے۔ زمانۂ ماضی میں ان بارکوں سے یہ امر بھی محقق تھا کہ جی بارک میں فٹ بال کیپٹن اور بوھر آلبر کا نشیمن تھا۔ ڈی بارک میں جبابیت کا پریسیڈنٹ رہتا تھا اور ممبروں کا مرکز تھا۔ سی بارک میں کرکٹ کپتان اور لوفروں کے سرگروہوں کا مسکن تھا۔

صبح صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو یا تحا لونڈ کے سامنے کا منظر یہاں کا قابل دید ہوتا ہے لوٹے بھرے ہوئے ننگے سر، گریبان چاک، بعض مع پتلون و سگریٹ چمن میں ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ طواف پاخانہ ہو رہا ہے۔ کسی کو عجلت ہے تو کبھی اس دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔ کچھ مستقل مزاجی سے اپنے نمبر آنے کے منتظر گپ شپ اڑا رہے ہیں۔ کہیں نمبر پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ میں پیشتر کا ہوں۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں میں ہوں۔ گویا زیارت قدمگاہ کے لئے ایک گونہ اضطراب ہے۔ اس نظارے کے بعد بارک کی طرف جب آپ نظر اوٹھا کر دیکھیں گے تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک انگیٹھیاں روشن پائیں گے۔ کہیں اسٹوو کی سنسناہٹ کی آواز آ رہی ہے تو کہیں کو ٹکڑو چٹخنے کی۔ ہر طرف میزیں درست ہو رہی ہیں۔ اون پر سفید سفید چادریں پڑی ہوئی ہیں رنگ برنگ کے چینی کے سٹ قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ چاء کا دور چل رہا ہے کہیں توس کی چھین جھپٹ ہے۔ چاء کا دور ختم ہوتے ہی ساغر صفا چٹ خان کی تلوار آبدار اپنی کاٹ چھانٹ دکھلانے لگتی ہے۔ ان دارالاقاموں کی زندگی بڑا سر ہونے میں میدان کارزار سے کچھ کم نہیں ہے۔ کالج کی پڑھائی کے وقت کے علاوہ ہر کوئی کسی نہ کسی شغل میں ضرور رہتا ہے لیکن یہاں کے ساحر اُن جانوروں میں سے نہیں ہیں جو اکیلے زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اُس قسم کے جانوروں میں سے ہیں جو ہمیشہ گروہ میں چلتے۔ ٹولیاں بنا کر بیٹھتے ٹیم بنا کر کھیلتے۔ اور غول بیابانی کی طرح علیحدہ علیحدہ گروہ بنا کر ٹہلنے کو نکلتے ہیں۔ اگر

آپ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بارک میں گشت لگائیں تو آپ کو کمروں کی
سجاوٹ میں بہت کم اختلاف ملیگا ۔ نیچے کا فرش ایک پٹی دار سرخ و نیلے موٹے کپڑے کا
جسکو سحرگاہ کی زبان میں علیگڈھ پیٹنٹ کہتے ہیں بنا ہوتا ہے ۔ بود و باش اور طرز طریقہ میں
بہت کم فرق ہے ۔ اور اوسکی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ اگر جمہور کے خلاف کوئی طرز اختیار کرتا ہے
تو وہ گوتو بنا لیا جاتا ہے ۔ عام زندگی میں چھوٹے بڑے سب ایک ہیں ۔ مگر کالج سیاسیات
میں جونیر اور سینیر کا خیال ضرور رہتا ہے ۔ رائے دینے میں تو کوئی جھجکتا نہیں ۔ البتہ اعلیٰ
طلبا کی رائے کو مقدم سمجھا جاتا ہے ۔ اور ہر معاملہ شورہ سے طے ہوتا ہے ۔

منٹو سرکل

اس میں آمنے سامنے اپنی طرز کی جداگانہ چار بلاک بنے ہوئے ہیں ۔
یہ پکی بارک سے آدھ میل پر واقع ہے ۔ اور کالج کی زبان میں عبور دریائے شور رہنے کے
نام سے پکارا جاتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ تعلیمی ارکان کالج نے ایک قانون پاس کیا ہے کہ
جو دو سال کسی درجہ میں ناکامیاب رہے تو اوس کو پکی بارک اور کچی بارک سے بیدخل کر دیا جاتا ہے
اور وہ منٹو سرکل کی نوآبادی میں بھیجدیا جاتا ہے ۔ یہ قانون اگرچہ ایک حد تک سخت ہے
لیکن اس حیثیت سے غنیمت ہے کہ کالج سے کلیتاً علیحدگی نہیں ہونے پاتی ۔ ورنہ زمانہ
حکومت آرچ بولڈ میں تو یہ قانون نافذ ہوا تھا کہ دو برس کا ناکامیاب شدہ طالب علم کالج
ہی میں رہنے نہیں پاتا تھا یہاں کی زندگی ابھی تک نوآبادی کی سی زندگی ہے ۔ کالج کی حقیقی
زندگی ابھی یہاں کے رہنے والوں میں سرایت نہیں ہوئی ہے ۔

صاحب باغ و سوسائٹی

یہ دونوں دار الاقامے طلباء قانونی کے لئے مخصوص ہیں ۔
اسکی طرز حکومت اور طرز زندگی بھی انڈیپنڈینٹ سلطنت کی سی ہے
انتظام اندرونی میں ایک حد تک خود مختار ہے ۔ لیکن تعلقات بیرونی میں
پرنسپل کے ماتحت ہے ۔

بارکوں کی عنان حکومت ایک جماعت کے ہاتھ میں ہے ۔ وہ اسطرح کہ ہر بارک میں

ایک سب پراکٹر ہوتا ہے۔ اور ان سب پراکٹروں پر ایک پراکٹر متعین ہوتا ہے۔ سب پراکٹروں کے ماتحت ہاؤس مانیٹر ہوتے ہیں کہ جو حاضری اور دیگر حالات طلباء کی نگرانی کرتے ہیں ان ہاؤس مانیٹروں کے درمیان ایک پارک کی تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اور ہر ہاؤس مانیٹر اپنی سلطنت کے کام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ان مانیٹروں کا انتخاب سب پراکٹروں کی سفارش پر پراکٹر کرتا ہے۔ لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد اس کی طرز حکومت میں تبدیل اور تغیر ہو گیا ہے۔ اب ہر پارک کے کئی حصے کئے گئے ہیں۔ اور ہر حصہ کا ایک علیحدہ اتالیق ہے۔ اور ہر اتالیق کے ماتحت ایک نائب اتالیق مقرر ہوتا ہے۔ اور ہر نائب اتالیق کے ماتحت ہاؤس مانیٹر ہوتے ہیں۔ کالج کے کل اتالیقوں کے اوپر ایک سینیر ٹیوٹر بطور افسر اعلیٰ کے متعین ہوتا ہے بیان یہ کیا جاتا ہے کہ یہ تبدیلی اسلئے ضروری سمجھی گئی کہ کالج کی وسعت کے ساتھ ساتھ طلباء کالج کی زندگی قدیمی سسٹم سے کمیونٹی سسٹم پر لائی جائے۔ قرن اولے میں طلباء کی تعداد اسقدر کم تھی کہ اپنے دائرہ خیال کے لوگوں میں ایک خاندان بنا کر زندگی بسر کرتے تھے اور ان کو اپنے ہم خیال اصحاب آسانی سے مل جاتے تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور کالج کی وسعت میں ترقی ہوتی گئی تو فیملی سسٹم پر آئندہ زندگی بسر ہونا غیر ممکن تھی اور اسلئے کمیونٹی سسٹم پر زندگی کو تبدیل کر دینا ضروری ہوا۔

لیکن یہ فوری تبدیلی اسوجہ سے نہیں ہوئی تھی کہ جسکا تذکرہ میں نے اوپر کیا ہے۔ بلکہ یہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کا نتیجہ تھا۔ جسکی تفصیل آئندہ موقع مناسب پر کیجائیگی۔

ڈائننگ ہال یہ ایک وسیع اور شاندار عمارت ہے کہ جسمیں تین بڑے دالان اور ایک بغلی کمرہ ہیں۔ تینوں دالانوں میں پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ لٹکتی لیمپ ہر طرف اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔ لمبی لمبی میزیں جنپر منقش سفید چادریں پڑی ہوتی ہیں۔ علیحدہ علیحدہ مٹی کی رکابیوں پر سرخ و سیاہ صراحیاں ایک دوسرے سے کچھ کچھ فاصلہ پر قرینے سے لگی ہوتی ہیں۔ اور ہر صراحی کے پاس ایک چمکتا ہوا گلاس جسپر کالج کا نام کندہ ہے۔

عجیب بہار دیتا ہے۔ بنتی کمرے میں باورچی خانے سے لاکر کھانا رکھا جاتا ہے۔ کھانا یہاں آتے ہی ملازمین کالج کے احاطۂ اقتدار سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور اب طلباء کے اپنے دائرہ حکومت کا دور شروع ہوتا ہے۔ کھانا کیا؟ افسر اسٹے جو ایک منتخب شدہ طالبعلم ہوتا ہے اوس کو پاس کرتا ہے۔ اور اوس کے بعد کھانا نکالے جانے کا حکم نافذ ہوتا ہے پلیٹ اسٹینڈ گرم ہوتے ہیں۔ شوربے کی رکابیاں اسٹینڈ میں سلیقے سے جمائی جاتی ہیں تاکہ گرم رہیں۔ ادہر صور پھونکا اور ادہر جوق کے جوق ساحر داخل ہوئے شروع ہوتے جو وردی کے خلاف پہونچا فوڈ مانیٹر نے دروازے ہی پر روکدیا۔ بیرے وردی پہنے رکابیاں لیئے دوڑ رہے ہیں۔ بہشتی کمر باندہے صراحی لیے جانے کے حکم کے منتظر کھڑے ہیں کہیں ایک گوشت لانے کی فرمائش ہو رہی ہے تو کہیں ایک دال کی پکار ہے۔ کہیں پنجابی روٹی کا شور ہے تو کہیں چپاتی کی مانگ۔ درسگاہ سحر آمدزمیں یہ وقت بھی قابل دید ہوتا ہے۔ سرخ سرخ ٹوپیاں کالی کالی وردی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فوجی مرکز ہے کہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ یہاں شاہ و گدا ایک حالت میں آتے ہیں اور ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے ہیں۔ اگر کسی کو معمول کے علاوہ کچھ کھانا منظور ہے تو علیحدہ قیمت ادا کرے اور علیحدہ پکوائے۔ دور محسنی میں دو درجے کے کھانے ہوتے تھے۔ ایک اعلے اور ایک ادنے۔ لیکن مشتاقی دور دورے میں یہ تفریق اوڑا دیگئی۔

اس محکمہ کی سلطنت کی باگ مفصلۂ ذیل افسران کے ہاتھ میں ہے۔

(۱) سپروائزر ڈائننگ ہال = ہمیشہ انگریز یا یورپ کا تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔

(۲) سینیر فوڈ مانیٹر = ہمیشہ کوئی اعلے جماعت کا طالب علم ہوتا ہے۔

(۳) فوڈ مانیٹرس = یہ بھی ہمیشہ طالب علم ہوتے ہیں۔

یہ کیبنٹ اسطرح بنتی ہے کہ ہر بارک کا ٹیوٹر اپنے یہاں کے بارک کے چند طالب علموں کو منتخب کرتا ہے۔ اور سینیر ٹیوٹر ان میں سے تعداد معین کا انتخاب کر لیتا ہے۔ یہاں پر ہیز کی

کہانا بھی ملتا ہے جو بیماروں کے لئے مخصوص ہو۔ پرہیزی کہانے اور معمولی کہانے میں صرف
سرخ اور سیاہ مرچ کا فرق ہوتا ہے۔ البتہ حسب ہدایت ڈاکٹر یا حکیم یا بادائگی فیس
زاید دوسری قسم کا کہانا بھی تیار ہو سکتا ہے۔ یہاں کے کہانے میں یہ عجیب بات ہے
کہ اگر ایک عرصہ بعید کے بعد بھی لوٹ کر آنے کا اتفاق ہو تو منو وہی ہوگا چاول روزانہ۔
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا باورچی خانہ ایک خاص قسم کی مشین ہے کہ جسمیں
ڈگری اور ٹمپریچر کا اندازہ کرکے ہمیشہ ایک ہی سا کہانا پکایا جاتا ہے۔ دال ماشاء اللہ ایسی
ہوتی ہے کہ اگر ناک پکڑ کر غوطہ لگائیے تو تہہ میں بھی دال کا ایک دانہ نہ پائیے گا۔ پلاؤ البتہ
لاجواب پکتا ہے۔ ساتھیوں کی آرزو رہتی ہے کب پیر اور بدھ کا دن آئے۔ اور پلاؤ کہانے
کو ملے۔ یہی دو دن پلاؤ کے لئے مخصوص ہیں۔ جمعہ کے دن زردہ اور فیرینی ملتی ہے۔

یونین کلب

یہ وہ کلب ہے کہ جہاں طلباء کا اپنے چندے سے کتب خانہ قائم
کیا گیا ہے۔ اس کے جملہ اراکین سوائے پریسیڈنٹ اور خزانچی کے سب طلباء ہوتے ہیں
دنیا بھر کے اخبار یہاں میزوں اور اسٹینڈ پر قرینے سے موجود رہتے ہیں۔ کتب بینی کے لئے
ایک خاص کتب خانہ ہے۔ یہ طلباء کی اپنی حکومت کی جگہہ ہے۔ اور لوکل سلف گورنمنٹ
کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ یہی وہ جگہہ ہے جہاں سے بڑے بڑے مقرر اور قابل لکچرر نکلتے
ہیں۔ ہر سنیچر کی شب کو یہاں تقریریں ہوتی ہیں۔ عمارت پہلے تو کچھ زیادہ وسیع نہ تھی
لیکن اب ایک وسیع پیمانے پر بنائی گئی ہے۔ پہلی عمارت میں ایک ہال تھا۔ جسمیں آدھا
گرہ بجوش اور مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے اور آدھا ارکان حل و عقد و صدر جلسہ کے متمکن
ہونے کے لئے مخصوص تھا۔ اس موخرالذکر آدھے ہال سے ملی ہوئی دو گیلریاں تھیں
کہ جنمیں تھیٹر جیسے اوتار چڑھاؤ کی بنچیں پڑی ہوتی تھیں جو سامعین کے لئے مخصوص
تھیں۔ ایک کمرہ دارالوزرا تھا اور دوسرے میں کتب خانہ۔ لیکن اب ایک دو منزلی
عمارت نہایت وسیع پیمانہ پر بنائی گئی ہے۔ اور سامعین کے لئے اوس کے بڑے

ہال میں دنیا کے جرناؤ کی نہایت نفیس گلدستے ا بنچین بچھی ہوئی ہیں۔ اوپر کی منزل
درمیان سے کھلی ہوئی ہے۔ تاکہ نیچے کی منزل اور اوپر کی منزل کا منظر ایک رہے
دوسری منزل میں چاروں طرف گیلریاں ہیں۔ تاکہ سننے والے نیچے اور اوپر دونوں
جگہ بیٹھکر سن سکیں۔ اسی اوپر کی منزل میں آجکل کتب خانہ ہی۔ اور اخبار کے اسٹینڈ
بھی یہیں لگائے گئے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہی کہ جسقدر ظاہری شان اس کی بڑھگئی ہی
اوسیقدر علمی شان اوسمیں مفقود ہی۔

اسی سلطنت کے ارکان کے انتخاب نے کالج میں دو پارٹیاں قایم کردی تھیں۔
ایک کا رائلسٹ اور دوسری کا نام سیلیشین تھا۔ اوسوقت میں رائلسٹ کے رہنما میاں
جینا اور سیلیشین پارٹی کے رہبر محمد حسین تھے۔ افسران یونین کا انتخاب پرچے کے
ذریعہ ہوتا ہے۔ اسکی تاریخ ایک دو مہینے پہلے مقرر ہوتی ہے۔ تاریخ کے اعلان کے
ہوتے ہی ممبران ہر پارٹی اپنی اپنی پارٹی کے ووٹ کے لئے کوشش کرتے ہیں۔
کنوسینگ پارٹیاں نکلتی ہیں اور رات رات بھر اور دن دن بھر گشت لگاتی ہیں۔ لوگوں کو
اپنی طرف کرنے کی مختلف صورتوں سے کوشش کیجاتی ہے۔ کہیں آم پارٹی ہو رہی ہے
تو کہیں ڈنر پر لوگ بلائے جا رہے ہیں۔ کہیں چاہ کی دعوت ہی۔ تو کہیں لوگوں پر تعلقات
اور حقوق کا اثر ڈالا جا رہا ہے۔ کہیں آیندہ کے وعدوں پر لوگوں کو لبھایا جا رہا ہی۔

سنہ ۱۹۰۲ء کے انتخاب میں پارٹی کی مخالفتیں اعلے پیمانہ پر پہونچ گئی تھیں۔
اور شہر کے طالبعلموں کو روپیہ کے ذریعہ اپنی طرف کیا جا رہا تھا۔ معینہ تاریخ پر رائے
دینے کا وقت مقرر ہوتا ہی۔ اور اُسوقت پر یونین کے سامنے رائے دہندوں کا سیکڑوں
کی تعداد میں مجمع ہوتا ہے۔ ہر پارٹی کا یہ زور ہوتا ہے کہ اُسکے ممبر عجلت سے ووٹ دیں
اگرچہ ہر پارٹی کے امیدواروں کے نام پارٹی کی طرف سے علیحدہ علیحدہ طالبعلموں میں
تقسیم کرنے کے لئے چھاپے جاتے تھے۔ لیکن جس کا نمبر ووٹ دیا جاتا ہے وہ کلب

کی جانب سے چھپتا ہے۔ اور اوس میں پارٹی کے ممبروں کے نام یکجائی چھاپے جاتے
ہیں۔ چونکہ ایک زمانے سے رائیلسٹ کامیاب ہوتے آئے تھے اس لئے پیلیٹین اس
سال اس کا سخت زور لگا رہے تھے کہ رائیلسٹ کو شکست دیجائے۔ نوبت لڑائیوں
تک پہونچگئی تھی۔ اُس سال الکشن کی صبح کو یہ واقعہ ہوا کہ ووٹ شروع ہونے سے
قبل رائے دہندوں کی فہرست سے پیلیٹین پارٹی کو یہ شبہہ ہوا کہ اُن کی تعداد میں خفیف
کمی ہے۔ اس لئے اونہوں نے رائیلسٹ زور کو توڑنے کے لئے پھکیتیاں شروع کی
ساحرپوری (یعنی) کہ محمود قوم جو اُسوقت اسکول میں دسویں کلاس میں تھے اور جو پیلیٹین حلقہ
اسکول کے بڑے رکن اور اونکے گرگوں نے ایک اسکول کے طالب علم کو
(اُس زمانے میں نویں اور دسویں درجے کے طالبعلم یونین کے ممبر ہوسکتے تھے)
جسکا ایک عزیز رائیلسٹ تھا۔ بخوف اس کے کہ یہ پیلیٹین کو ووٹ نہ دے راس کلاں یعنی
کہ میاں تصدق شروانی کے کمرے میں بند کردیا۔ نیچے وہ اور اوپر چارپائی۔ کمرے کا
قفل بند۔ اس کا کسی کو خیال بھی نہ گذر سکتا تھا۔ مگر خدا معلوم کسطرح رائیلسٹ کے ایک
جاسوس کو اس کا حال معلوم ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ رائیلسٹ کی فوج
کا ایک دستہ کمرے نمبر ۲ پر آوارد ہوا۔ اور اوس نظر بند لڑکے کی برہائے اپنا ووٹر
ہونے کے رہائی کی درخواست کی۔ راس کلاں اور پھر اُنکی جوڑ میں کھنا ناتھی (آصف
کیوں اس درخواست کو منظور کرنے لگے تھے۔ ادہر اصرار اُدہر انکار بات میں بات بڑھنے
لگی۔ اب کیا تھا رائیلسٹ اور پیلیٹین فوج کے دستے لاٹھیوں۔ ڈنڈوں اور ہاکی اسٹکوں سے
مسلح ہر چہار طرف سے اپنی اپنی فوج کی امداد کے لئے آپہونچے۔ بندہ کو ایسا کب
اتفاق ہوا تھا۔ اور ابھی آئے ہوئے بھی مہینہ بھر نہیں ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی جھٹ کمرے
کے دروازے پر پہونچا۔ اور چک کے اندر سے نظارہ کرنے لگا۔ فریقین کی جانب سے
ہر دو فوجوں کو حملے کا حکم دیا جانے ہی والا تھا کہ دیو سفید قرنا (سٹرکا زنا) آپہونچے

اور دونوں فوجوں کے درمیان سفید جھنڈی دکھا دی۔ جب ذرا دونوں فوجوں کی طرف کے
نبرد آزماؤں کا جوش کم ہوا تو واقعات کی تفصیل چاہی۔ کمرے کو کھلوا ان صاحب کو پلنگ
کے نیچے سے نکالا۔ حضرت کا سن بیس بائیس برس کا تھا۔ ماشاءاللہ ڈیل ڈول میں خاصے
اور کالیجیٹ اسکول کے پڑھے ہوئے طالب علم لیکن جب نکلے تو اس شان سے کہ بدن
تھر تھراتا ہوا ہونٹ ہلتے ہوئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری۔ آخر کار بہزار دقت
و بسیار دو یوسفید اور فریقین کی فوج کے نبرد آزماؤں کے سمجھانے سے آنسو تھمے
لیکن عرصہ تک پھر بھی سسکیاں بھرتے رہے ؛

کھیل یہاں کھیل دو قسموں پر منقسم ہیں۔ ایک آؤٹ ڈور گیمس۔ اور دوسرا اِن ڈور گیمس
اِن ڈور گیمس تقریباً سب یونین کی عمارت میں ہوتے ہیں۔ مثلاً پنگ یا نگ۔ اِن
اینڈ آؤٹ۔ تاش۔ شطرنج۔ انگریزی قسم کی چوسر وغیرہ آؤٹ ڈور گیمس میں کرکٹ
فٹ بال ٹینس۔ ہاکی۔ رائیڈنگ اور پکنک ہیں۔ کرکٹ اور فٹ بال ہی یہاں کی
خاص شہرت ہے۔ کرکٹ کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ سمندر پار تک ہے
لیکن کچھ عرصہ سے فٹ بال اور ہاکی کی طرف توجہ خاص طور پر کیجا رہی ہے۔
گرمیوں میں کبھی کبھی کبڈی بھی کھیلی جاتی ہے کرکٹ کے کھلنڈرے۔ علی حسن
چچا ضیاءاللہ۔ شوکت علی۔ احسان۔ سعید محمد شفقت۔ سلام الدین۔ بھونڈو۔
(سید حسین) مشہور و معروف ہیں اور آخر الذکر تین تو انگلستان تک اپنے فن کا
سکہ بٹھا آئے ہیں فٹ بال میں مسعود الحسن۔ تصدق اور بینے ہاکی میں۔ اسد اور
نورالدین مرحوم ٹینس میں۔ نعیم اللہ۔ علی رضا مشہور ہیں ؛

کپتان کی یہاں خاص عزت ہے۔ اور وہ طلبا ر کالج میں بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے
اک زمانے میں اِن کا ممبران اسٹاف پرنسپل و ٹرسٹی صاحبان ایک خاص طور پر
لحاظ رکھتے تھے پرنسپل کپتان کی سفارش سے اوس کی ٹیم کے چند کھلنڈروں کا

کا وظیفہ منظور کرتا تھا۔ مختلف جگہوں کی حاضریوں کی پابندی سے یہ آزاد تھے۔ کمرہ انکو ایک خاص دیا جاتا تھا۔ دار الاقامے۔ ڈائننگ ہال اور یونین میں ان کو خاص خاص حقوق حاصل تھے۔ مگر زمانے کی گردش نے وہ سب کھیل مٹا دیا۔ اور اب کپتان کا وہ اعزاز نہیں رہا۔

پکنک یہ مشغلہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ یہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ ایک پارٹی پچاس ساٹھ طلباء کی بنائی جاتی ہے اور ایک جگہ مقرر کرکے ایکدن صبح کو اُن سب کو جمع کیا جاتا ہے اور تقریباً پانچ چھ میل کے فاصلہ پر کوئی مقام پہنچنے کیلئے منتخب کرلیا جاتا ہے ان میں سے کچھ کو ہیر (خرگوش) اور کچھ کو ہاونڈ (شکاری کتے) بنایا جاتا ہے کچھ شکار پارٹی کے لئے منتخب کرلئے جاتے ہیں۔ ہر قسم کی کچی جنس سوائے سوختہ کے اس منتخب شدہ مقام پر کہ جہاں پہنچنا ہے پہلے سے بھیجدی جاتی ہے۔ ہیر پارٹی کے لئے پچرنگے کاغذوں کے لچھے بناکر حوالہ کردئے جاتے ہیں۔ اور یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ اپنا سراغ دینے کے لئے کاغذوں کے لچھے ایک ایک دو دو فرلانگ کے فاصلہ پر ڈالتے جائیں۔ اور جہاں ایک سے زیادہ سڑکیں پھٹتی ہوں تو اُس سڑک پر کہ جسپر جانا منظور ہے۔ پچرنگے کاغذوں کا ڈھیر لگادے ہاونڈ پارٹی کی روانگی سے ہیر پارٹی آدھ گھنٹے پیشتر روانہ کی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد ہاونڈ پارٹی اُن کی تلاش میں روانہ ہوتی ہے۔ مقام مقصود پر پہنچ جانے کا ہر پارٹی کو وقت بتادیا جاتا ہے۔ پروفیسران کالج ٹرسٹیان اور دیگر عمائدین جو اس میں شریک ہوتے ہیں وہ یا تو شکار پارٹی میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اور یا بہ تقاضائے سن یا طاقت یا پیادہ یا گاڑی گھوڑوں پر سوار اس مقام تک وقت مقررہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پہنچکر کل تعداد میں سے ایک معین تعداد

مقرر کی [illegible]

لکڑی لانا۔ پانی بھرنا۔ کھانا پکانا۔ اپنے اپنے خاندان کے لئے تجویز ہوتا ہے۔
اُن میں سے کچھ تعداد علیحدہ کر لی جاتی ہے۔ جن میں سے بعض لیسر ہٹے کی دُکان
پر متعین کئے جاتے ہیں اور بعض گوشت کی دوکان لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اب ہر خاندان
کا کیمپ علیحدہ علیحدہ پڑتا ہے اور بحساب اپنے ممبروں کے اِس اپنی ساختہ دوکان
سے جنس لیکر کھانا پکانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بہتر پکانے
کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اُس وقت کا نظارہ بالکل ایک فوجی پڑاؤ کا سا ہوتا ہے۔ کہ ہر ٹکڑی
اپنے ممبروں کے لئے سامان مہیّا کرنے کی دوا دوش میں ٹکڑیوں کے حملے سے
بچانے کیلئے پہرہ دینے میں مشغول ہوتی ہے۔ کھانا جب پک کر تیار ہو جاتا ہے
تو اپنے اپنے کھانے میں سے ایک دوسرے سے کچھ تبادلہ بھی ہوتا ہے ممبران
اسٹاف ٹرسٹیان و معاونین بھی اکثر گریجوٹس کے خاندان میں یا تو شامل ہو کر کام کرتے
ہیں یا اُن کے مہمان بن جاتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے تیار کردہ کھانے میں سے اُن
کے لئے کچھ تحفتاً بھیجا جاتا ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس خاندان نے کون سی اچھی
چیز تیار کی ہے۔ اس کے بعد تمام کیمپ کا فوٹو لیا جاتا ہے اور کالج کو واپسی ہوتی
ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتغال قفتن میں یہ کالج میں سب سے بہتر اور مفید چیز ہے

ہسپتال یہ خوشنما عمارت بڑی سُرخ اینٹ سے تعمیر کی گئی ہے۔ چاروں
طرف وسیع صحن ہے۔ ایک ہال ڈاکٹر صاحبان کی نشست کے لئے مخصوص
ہے۔ دوسرے ہال میں کمپونڈنگ روم اور تیسرا میڈسن اسٹور ہے۔ باقی
تمام کمرے بیماروں کے لئے مختص ہیں۔ یوں تو اس کا اسٹاف بہت زبردست ہے

(۱) ایک میڈیکل آفیسر

(۲) ایک ہاسپٹل اسسٹنٹ

(۳) تین کمپونڈر

سول سرجن سول ہسپتال بھی اس مد سے تنخواہ پاتا ہے۔ لیکن وہ صرف ضروری معالجات میں بلایا جاتا ہے۔ البتہ ہفتہ میں ایک روز معمولاً اُن کے آنے کا مقرر ہے۔ مگر اس ہسپتال سے کالج کے لڑکوں کو کبھی اطمینان نہ ہوا۔ اور ہوتا بھی تو کیوں ہوتا کہ معمولی آپریشن کرنے میں جب کسی ڈاکٹر سے زخم کے اندر نشتر ٹوٹ جائے۔ اور اس کو معلوم نہ ہو۔ دکھتے دانت کی جگہ اچھا دانت باوجود چیخنے چلانے کے نکال کر پھینک دیتے ہیں جس کو تردد نہ ہو۔ سلوجرم جو مرض تشخیص کرتے ہوں تو پھر بھلا اُن سے طبیعت راغب ہو تو کیونکر۔

شاخ یونانی اس کی تعریف میں صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ کالج کے طلبا کے لئے یہ کھانا تبدیل کرانے کا آلہ اور ذائقہ کے لئے مختلف شربت اور معجون کھانے کا مخزن اور مقویات باہ کے مہیا کرنے کا اچھا ذریعہ ہے ورنہ ویسے تو اللہ کا نام ہی نام ہے ٭

بابِ چہارم

مختلف کلب و سوسائٹیاں

اِس درسگاہِ سحر آموز میں چند ایسے کلب اور سوسائٹیاں ہیں کہ جن کا تذکرہ کئے ہوئے بغیر کالج کی زندگی کی ایک حیثیت بلا روشنی ڈالے رہجائے گی۔ لہٰذا اُن کا اختصار کیساتھ تذکرہ لازمی ہوا۔

تاڑا کلب اِس کلب کی بنیاد صرف یونین الکشن پر قائم ہوئی تھی۔ اور یہ وہ کلب ہے کہ جس کی تعریف مسٹر ہارلیس پرنسپل کالج نے اپنی سالانہ رپورٹ

[illegible]

کہ جو داخلہ کالج چاہتے ہیں اسٹیشن پر استقبال کیا جائے اور اُن کو داخلے میں
ہر طرح سے مدد دی جائے اور جب تک جگہ ملے اُن کو اپنے یہاں مہمان رکھا جائے
تو وہ یقیناً ہر طرح ہمارے مشکور ہوں گے اور کچھ عرصہ تک کالج میں اُن کی
نقل و حرکت ہمارے اشارے اور صلاح سے ہوگی اِس طرح الکشن کے وقت
ہر سال ایک نئی تعداد ہمارے ووٹروں میں بڑھتی رہے گی یہ کلب ایک عرصہ تک
قائم رہا۔ علاوہ اِس کے کہ اِس کلب نے اپنی پارٹی کی امداد کی وہ نئے طالب علموں
کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا یہ کلب انسٹیٹیوٹ گزٹ میں نئے طلبار کی اطلاع
کے لئے اپنا اشتہار شایع کراتا تھا اور اِس کی وجہ سے نئے رکروٹوں کو داخلہ میں
کوئی وقت نہ ہوتی تھی۔ اِس کی بنا کیسی ہی کالج کی سیاسیات پر مبنی ہو لیکن جو
کام اِس کلب کے ذریعہ انجام پاتا تھا وہ نہایت ہی مفید اور قابلِ تعریف تھا
ایسے بے ضرر ذرایع کی مثال کالج کی سیاسیات کی تاریخ میں بہت ہی کم نظر آتی ہے

بھیا سوسائٹی یہ وہ سوسائٹی ہے کہ جس کی بنا سے پہلے بھیا بہادر
محمد بخش کے نام سے ہوئی گویا اِس خاندان کے یہی باوا آدم ہیں۔ چنانچہ متعلم ساحران
کالج کے دماغ میں جب یہ خیال پیدا ہوا کہ کالج میں ایسے ساحروں کی بھی
ذات بابرکات موجود ہیں جو علاوہ شئے لطیف کے کم رکھنے کے عجیب و غریب
حرکات و سکنات کا مخزن ہیں تو انہوں نے یہ تجویز کیا کہ اِس خاندان کا
نام بھیا رکھا جائے اور بھیا ڈب کرنے کا باقاعدہ جلسہ ہوا کرے اور اُس میں
بھیا بہادر کا وہ خط کہ جو کابل سے آیا تھا اِس کا مستقل سپاس نامہ قرار پایا اور
یہ سپاس نامہ ہر بھیا کی خاذوب کرتے وقت پڑھنے کے لئے مخصوص کیا گیا
جس کا ترجمہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے

سپاس نامہ | کابل ۲۴ ر نومبر

میں ایسا ہی تلخ ہونگا جیسے کہ راست گوئی۔ اور میں اُسی طرح اٹل رہوں گا۔
جس طرح سے کہ انصاف۔ میں سرگرم ہونگا۔ میں مبہم تقریر نہیں کرونگا۔ میں معاف
نہیں کروں گا۔ میں ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا اور مری تقریر کو سننا پڑیگا
میرے وفادار مریدو تم کو نہایت تعجب ہوگا بلکہ یہ معلوم کرکے تم چونک
پڑو گے کہ میں ٹھیک ۱۵ ار نومبر کو کابل پہنچا۔ جبکہ میں جاپان چھوڑ رہا تھا مجھکو
بھیوں کی جماعت کی طرف سے ایک مختصر اردو نظم ملی تھی جس میں مجھ خاکسار
کی ذات کی والاصفات کا اضافہ کے ساتھ تذکرہ تھا میں نے اس کو صحیح و
خوشی اور قابلِ معافی غرور کے احساسات اور تخیلات کے ساتھ پڑھا۔ اب
میں اپنے موجودہ اشغال اور اپنے اردگرد کے حالات کا ایک مسلسل اور
جامع عام خاکہ جس قدر صحیح اور اختصار کے ساتھ ممکن ہوسکتا ہے دینا تجویز کرتا ہوں
شروع میں میں تم کو یہ بتلاتا ہوں کہ میں دارالخلافہ میں میر عمارات کے عہدہ پر
کہ جس کا محکمہ ایک بڑے پیمانے پر ہے فائز المرام ہوں میں اس سخت ذمہ واری
کے قبول کرنے کو ہرگز راضی نہ ہوتا اگر مجھکو اِس امر کا یقین نہ دلایا جاتا اور مستقل
وعدہ نہ کئے جاتے کہ مجھکو ہر روز کافی وقت اپنے مذہب کے مقاصد بیان کرنے
اور اغراض پیش کرنے کی غرض سے لیکچر اور وعظوں کے لئے بلاکسی ضغطہ
کے دیا جائے گا۔ اگرچہ نہایت شریفانہ اور اعلیٰ خیالات اور محسوسات سے میں متاثر
ہوتا تو میں کبھی دنیا کے اِس حصے میں جو کہ خشک اور بھیانک سڑکوں سے گھرا ہوا ہے
اور جہاں قدم قدم پر بے تعداد خطرے اور مشکلات واقع ہوتے ہیں اِس تکلیف
عظیم کو برداشت کرنے کیلئے جرأت نہ کرتا در حقیقت میں ضرورت کی بنا پر یہاں
آیا ہوں۔ کابل پہنچکر میں اپنے دفتر کے مختلف فرائض کا امین کیا گیا موسم کی سختی
کام کی زیادتی اور بے انتہا جانفشانی نے مجھکو بہت کمزور کردیا ہے۔ مری اچھی

تندرستی رفتہ رفتہ ان پریشانیوں کیوجہ سے نہایت خراب ہو چلی ہے۔ اور مختلف
فرائض جو میری سپرد کر دئیے گئے ہیں اور یہی میرے لئے باعثِ کلفت ہیں۔
بھیا ازم کا یہاں پھیلانا سخت ٹیڑھی کھیر ہے۔ جاپان سے یہ جگہ بالکل مختلف ہے
کہ جہاں یہ مذہب بہت آسانی سے پھیل گیا جب میں نے پہنچکر اپنے مذہب کے سادہ
اصولوں کی تلقین کی تو اس کی دھواں دھار پر مخالفت ہوئی۔ اس جگہ کے
سرکش اور سنگدل افغان مجھ سے بحث کر کے نتیجہ پر پہنچنے کے لئے الجھنے
لگتے ہیں۔ لیکن میں یہ محسوس کر کے خوش ہوں کہ تمام مخالفت کی تیز آگ اب
سست ہو چلی ہے جس قدر زیادہ میں اپنے اصول اور قوانین کو بیان کرتا
ہوں اتنی ہی کمی سے اب ان کی مخالفت ہوتی ہے مری راستبازانہ کوششیں
اب بار آور ہوتی نظر آتی ہیں کیونکہ میں بے انتہا صبر اور نہ تھکنے والی مستعدی
سے کام کر رہا ہوں میں اِس ضرب المثل کی سچائی پر یقین رکھتا ہوں " ایک
جلد باز ماہی گیر مچھلی ضایع کر دیتا ہے"۔ میں سخت متحیر ہوں اور اس امر کے
سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم میں سے کوئی بھی ایثار کرنے والا نہیں ہے تم کو یہ
محسوس ہونا چاہیئے۔ کہ بحیثیت راست باز بھیا ہونے کے تمہارا فرض عین ہے
کہ تم ہر اک ممکن امداد اِس بہاڑ جیسے کام میں مجھکو دو۔ خدا کو روشن ہے کہ میں
کس قدر زیادہ تکلیف میں ہوں مجھے اپنے مذہب کی استواری اور سادگی کی طرف
لوگوں کو متوجہ کرنے میں آسمان و زمین ایک کر دینا پڑتا ہے کابل میں نئے نئے
قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ہر منٹ اُلٹے الزامات اور تہمتیں مجھپر ہوتی
جاتی ہیں اور جن کا کوئی اختتام نہیں ہے میرے خیال میں یہ نہیں آتا کہ پھر تم
اس میں کیوں حصہ لو۔ تم کو اِس امر پر قناعت نہیں کرنی چاہیئے کہ صرف
بحیثیت مقامی بھیا ہونے کے تم اپنے فرائض ادا کر رہے ہو ایسا خیال کرنا

ایک سخت غلطی ہے تمہارا کام محدود نہیں ہے۔ تمہارے سپرد صوبہ کی خدمت ہے اور میرے سپرد دیار اعظم کی سخت اور الجھنے والے افغان اور آفریدیوں کو سادہ اور پرامن زندگی بسر کرنے والا بھیا بنانے میں مجھے ایک پیغمبر کا کام کرنا پڑتا ہے بس اسی قدر تفصیل میرے کام کے متعلق کافی ہے ہندوستان سے ایک اللہ تجویز میرے پاس حال میں پہنچی ہے مجھے درخواست کی گئی ہے کہ میں سیاسیات میں دخل دوں اور سلطنت کے معاملات کے متعلق ایک پرشکایت تقریر کروں لیکن اس تجویز کی مناسب وقعت کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ مجھ سے اور ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے پہلے خط میں میں نے اس امر کا وعدہ کیا تھا کہ اپنی خلافت کے مسئلہ پر لکھوں گا لیکن میرے پاس بوجہ دیگر ضروری اور سنجیدہ مضامین کے جن پر کہ ہمارے مذہبی اور دنیاوی معاملات کا انحصار ہے اس امر پر لکھنے کیلئے کافی وقت نہیں۔ آئندہ خط میں اس امر پر کافی غور کرنے اور امیدواران خلافت کی قابلیتوں اور ناقابلیتوں پر بحث کرنے کے بعد جنہوں نے خلافت کے مدعی ہونے کی جرأت کی ہے اپنا جانشین تجویز کروں گا لیکن یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ میں جب یہ کہتا ہوں کہ سمجھ کی عام تاریکی۔ نشئے لطیف کی کمزوری۔ ذہن کی نارسائی۔ بدصورتی۔ قوت فیصلہ کی دھندلاہٹ مقصد کے اندھے پن میں جو سب سے زائد ہو تو اس جانب اشارا ہے کہ وہ گروہ بھیایا میں سب سے اعلیٰ اور افضل ہے اس کے علاوہ اس کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ تحریک بھیاازم میں اپنے آپ کو بالکل ختم اور مدغم کر لیا ہو میرے خیالات مفصلۂ ذیل انگریزی شعر میں خوبصورتی کے ساتھ جمع کر دیئے گئے ہیں۔

جو تم سب کا نصب العین ہونا چاہیئے "بے شعوری اور سادہ لوحی جو ہر ہیں جبکہ وہ کسی شخص میں مجتمع پائے جائیں"۔ آپکا وفادار۔ بھیا بہادر۔ الف۔ بی۔ ڈی

اُس روز سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ ایک عالم جلسہ میں کسی ایسے شخص کو جو اس خطاب کا اہل ہوتا ہے اُس کی تاج پوشی کے وقت یہ خطاب عطا ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے ہر سادہ لوح اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بنایا جا سکتا اُس میں ان خاص خصوصیات کا ہونا کہ جن کا تذکرہ متذکرہ بالا سپاس نامے میں کیا گیا ہے لازمی ہے:۔

خاندان یوم | یہ خاندان بھی کالج میں مشہور و معروف ہے۔ اس کی بنا میرے زمانے سے بہت پہلے پڑ چکی تھی جس زمانہ میں کہ میں کالج میں داخل ہوا ہوں تو یوم اکبر یعنے چودھویں یوم کا یہاں نشیمن تھا آپ طلسم کشائے طلسم اظہر بھی اپنی اختراعات کی وجہ سے کہلاتے تھے۔ اس خاندان کا ممبر وہی ہو سکتا ہے کہ جو قابل ہو مگر شے لطیف کی اُس میں کمی ہو مزاج کا چڑچڑا ہو۔ کسی نہ کسی پارٹی کا لیڈر رہو۔ اور اگر یہ نہ ہو تو کسی نہ کسی حیثیت سے بڑا آدمی سمجھا جاتا ہو۔ سوسائٹی سے بھاگتا ہو تنہا پسند ہو۔ اکثر زندگی بسر کرتا ہو۔ اس زمانہ میں ایک اور صاحب بھی اس خاندان میں شامل کر لیا گیا تھا لیکن بعض خاص صفات کی چونکہ اُن میں کمی تھی اس لئے وہ یوم کچہ کے لقب سے مشہور رہوا:۔

بھبوق کلب | یہ کلب اودھ والوں کی ساخت تھا۔ اس میں زیادہ تعداد اودھ سے آنے والے ساحروں کی تھی اور خال خال دوسرے صوبوں کے طالب علم بھی ممبر بنائے جاتے تھے اس کلب کے ممبران کے انتخاب میں بلیک بال کا قاعدہ مروج تھا اور اس لئے تعداد اس کے ممبران کی ہمیشہ محدود رہتی تھی اس میں مختلف شان کے لوگ شامل تھے قابل و مقرر بھی تھے شاعر بھی تھے۔ بذلہ سنج بھی تھے۔ گانے والے بھی تھے۔ عاشق مزاج بھی تھے جھینپا بھی تھے۔ رند مشرب بھی تھے۔ اور لوفر بھی تھے۔ اس زمانہ میں مفصلہ ذیل ممبران کو شہرت حاصل تھی:۔

(۱) حقہ نوش پلنگ سوار خرمل خرمل میاں بدربل۔

(۲) بذلہ سنج پارہ تمثال دل پھینک بہادر میاں ولایت علی۔

(۳) رندی و خرابانی میاں راجہ غلام حسین۔

(۴) رسالہ چاٹ اخبار نوش شب پری میاں عزیز الرحمٰن۔

(۵) گمہ ٹیر مہا دمہ کہبا ظہور یہ

باب پنجم

چند روایات کالج

فاختہ اُڑاتا کبوتر اڑانا۔ کنکوے اُڑانا تو اکثر سنا تھا۔ مگر فاختہ اُڑانا یہیں کے لئے مخصوص ہے اول اول سنا تو کان کھڑے ہوئے کہ یہ کیا بلا ہے ہیں کسی سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ کہیں مذاق نہ بنا لیا جائے لہذا خاموش ہی رہا کہ کبھی نہ کبھی ان پر اسرار الفاظ کا خود ہی انکشاف ہو جائے گا۔ چنانچہ رات کا وقت ہے کوئی گیارہ بجے ہوں گے کہ ایک گروہ کا ایک سردار جھوٹے جھوٹے پیر ننگے سر بالکل بلی کی طرح داؤ گھات لگاتے چلے آ رہے ہیں قریب آ کر ایک سونے والے کے پیر پر روئی کا حبابی گول گالا بنا کر رکھ دیا اور دیا سلائی جلا کر اس کو آگ لگا دی۔ روئی کو آگ کا پکڑنا تھا کہ وہ لکا بھات سے ہو گیا اور سونے والا سی سی کرتا ہوا پیر یا ہاتھ کو ملتا جاگ اٹھا بھونچکا ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے تو کوئی نظر نہیں آتا مگر حضرت کو یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ ایک صاحب انہیں کے پلنگ کے نیچے لیٹے لیٹے ہوئے ہیں اور دو چار صاحب ادھر اُدھر کمروں کے ستونوں سے لگے کھڑے ہیں پلنگ کے نیچے والے صاحب

یا تو اُن کے پھر لیٹتے ہی چپکے سے نکل گئے اور اگر زیادہ شرارت سوجھی تو پلنگ اُلٹ کر
یہ جا وہ جا۔ فاختہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک گرم دوسری ٹھنڈی۔ ٹھنڈی فاختہ کے
یہ معنی ہیں کہ برف کا ٹکڑا سوتے یا جاگتے آدمی کے کالر میں یا آستین میں چپکے
سے رکھ دیا جائے۔

مرے کا بھوت | جب شرارت کی ایک محور پارٹی نے غور کیا کہ ہندوستان
میں اکثر لوگ بھوت پریت اور جن و پری کے قائل ہیں اور نووارد ان کالج
میں سے اکثر پر یہ رنگ خوب چڑھا ہوا ہوتا ہے تو انہوں نے یہ قصہ گھڑا کہ
بڑھ کا درخت جو سامنے کھڑا ہے (اب یہ کاٹ ڈالا گیا) اس پر چند انگریز اور
ہندوستانی ۱۸۵۷ء میں پھانسی دیئے گئے تھے ان میں سے ایک مسٹر مرے
تھے جن کی روح نے اب تک یہ جگہ نہیں چھوڑی اور ہر شب کو اس کا بھوت
آج تک کمروں میں گشت لگاتا ہے چنانچہ یقین نہ ہو تو آدھی رات کے بعد
مکھن توس کی آواز سن لینا۔ دو ایک معقول آدمیوں نے نووارد سے
متانت کے ساتھ اس قصہ کو بیان کیا اور چار نے اُن کی تائید کی یہ بھلا وہ کیا
سمجھ سکتا تھا کہ یہ ٹکڑی کی ٹکڑی سازش میں شریک ہے تھوڑی دیر کے بعد باتوں
ہی باتوں میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اگر کچھ توس یا مکھن کی یا اور کوئی کھانے کی
چیز از قسم مٹھائی وغیرہ قبر پر رکھ دی جائے تو وہ واپس چلا جاتا ہے ورنہ
چارپائی اُلٹ دیتا ہے یا کرسی وغیرہ سونے کے اوپر رکھ دیتا ہے غرض تنگ
کرتا ہے اب یہ حضرت چکرائے یقین ہوتا تو کیسے نہ ہوتا ایک تو ایسی باتوں کے
قائل اور پھر چار پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگوں کا بیان ان کے دل پر خاص
خوف بیٹھ گیا یار لوگوں نے کچھ حصہ کا وقت دیا چپکے کی ٹھیرائی چنانچہ ایک نے
کمبل اوڑھا اور چپکے سے کمرے کے اندر گھس کر بیٹھ گیا جب ذرا نووارد صاحب

سونے لگے تو انہوں نے مکھن توس مکھن توس کی صدا شروع کی۔ دوسرے صاحب
جو پرانے ہوتے ہیں اور اس سازش میں شریک۔ اور وہ بھی اسی کمرے میں رہتے ہیں
لگے گگیانے۔ تو وارد صاحب ضاقی اوڑھے لیٹے ہیں۔ لرز رہے ہیں منہ کھولنے کی
ہمت نہیں اگر ذرا بزدل ہوئے تو چیخ نکل گئی اور رونا شروع کیا حملہ آور صاحب
مکھن توس مکھن توس کرتے چپکے سے غائب ہو گئے صبح کو چرچا ہوا علاج وہی
بتایا گیا کہ کچھ قبر پر کھانے کو رکھ دیا کرو ورنہ یہ بھوت بہت دق کرتا ہے کچھ
عرصہ تو خوب مٹھائیاں اڑائیں لیکن رفتہ رفتہ راز طشت از بام ہو گیا اور نو وارد
صاحب ایک نقصان مایہ اور دوسرے شماتت ہمسایہ کے مصداق بنے
اگر کچھ شئے لطیف کی ان میں کمی ہوئی تو لڑنے مرنے کے لئے طیار اور افسران اعلیٰ
سے شکایت کرنے پر کمر بستہ ہوئے جس کا نتیجہ سوائے مزید مذاق اڑنے اور
دق ہونے کے کچھ نہیں نکلتا یہ بھوت کا تماشہ جاڑوں کا مشغلہ ہے:۔

آپ بیتی

اول اول مجھ پر بھی یہ جال ڈالنا شروع کیا اول تو سن کر
استعجاب ہوا مگر اظہار خیالات سے پرہیز رہا صاحبان شرارت نے جب
دیکھا کہ مکھن توس کا وار خالی جا رہا ہے تو یہ حرکت شروع کی کہ رات کو
ایک صاحب غسل خانہ میں وارد ہوئے اور پانی ادھر ڈال کرتا ہے
اور مکھن توس کی الاپ شروع کرتے کئی روز تک جب یہ حال رہا
تو ساحر مجبوری جو سازش میں شریک تھے لگے کچھ اثر دکھانے اس وقت تو
واقعی کچھ خوف دل پر مسلط ہوا کئی دن کے بعد حسن اتفاق سے میں نے کچھ ہمت
کر کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کپڑا منہ سے ہٹایا اور خوف زدہ آنکھوں کو
پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں مسعود نامی ننگے دھڑ
ننگے اپنے بستر کی طرف عجلت سے آ رہے ہیں پھر تو یہ معلوم ہو کر خوب قہقہہ پڑا

اور اس پر اسرار بھوت کا راز ہمیشہ کے لئے مجھ پر کھل گیا۔

مڈ تھر ڈننگ اس سحر گاہ سحر آموز میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب برسات کی پہلی بارش ہوتی ہے تو سب ساحر مل کر بارش میں کپڑے پہنے ہوئے نہاتے ہیں اور ایک دوسرے کے کیچڑ ملتے ہیں۔ گویا برسات جو ہندوستان کے سب موسموں کی جان ہے اور جو شہزادی موسم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اس کی آمد پر خوب خوشیاں اور رنگ رلیاں مچائی جاتی ہیں۔ بارش ہونے کے وقت ننگے سر ننگے پیر کرتا پائجامہ پہنے ہوئے کیچڑ لتھڑی ہوئی سینٹھیوں کا تاج سر پر اس ہیئت کذائی کے ساتھ مختلف قسم کے جلوس ہر دار الاقامے میں نکلتے ہیں کہیں پیڑوں میں جھولا ڈالا جاتا ہے اور رنگ ترچھائے جاتے ہیں ان جلوسوں میں سوائے اُن کے جو بیمار ہوں سب کو شامل ہونا پڑتا ہے اگر کوئی شخص شریک ہونے سے گریز کرتا ہے تو اس کی بری گت بنائی جاتی ہے جس کی کوئی اپیل نہیں ہوتی۔ اس روز کالج بارش ہوتے ہی بند کر دیا جاتا ہے اور پروفیسر جلوسوں کا تماشہ دیکھتے ہیں بعض پروفیسر بھی شریک جلوس ہوتے ہیں اگر کسی کو کوئی عذر ہوتا ہے تو خواہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی اُن سے استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنا رومال نکالیں تاکہ اس پر کیچڑ لگائی جاوے سال بھر میں صرف اس کا ایک دن مقرر ہے دوسری مرتبہ کالج میں اس کا اعادہ نہیں ہونے پاتا:۔

کریکٹ کے کھلنڈروں کا راگ گرمیوں میں پکی بارک کی یہ بھی اک خاص شان تھی کہ بعد مغرب کریکٹ کپتان کے کمرے کے سامنے کریکٹ کے کھلنڈرے اور کچھ اور ساحر مثلاً عبدالوحید بہاری۔ عبدالرحمٰن سندھی کچلو سب مل کر مفصلہ ذیل اشعار الاپتے تھے کہ جو اُن کے جلسہ کا مخصوص گیت ہو گیا تھا:۔

اشعار

مری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا　　مری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا
اور جو پیٹ میں بچہ مر جاتا　　تو بتلا تیرا کیا جاتا
مری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا
تڑکے سے چہرن کو جاتی تھی　　اور پیٹ بھر ن کر آتی تھی
مری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا

خطابات ہر سال یکم اپریل کو ساحران کالج کو خطاب عطا ہوتے ہیں یوں تو بہت سے خطابات کی فہرستیں شایع ہوتی تھیں مگر قابل داد بھوق کلب کی فہرست ہوتی تھی کہ جس میں مناسب حال واقعات واقعی چھیڑ کئے ہوئے خطاب دئے جاتے تھے اور جن کو پڑھکر بجائے غصہ آنے کے تفریح ہوتی تھی

ناشتہ پر حملہ اشیا خوردنی پر حملہ کرنا بھی کالج کی روایات میں سے ہے۔ اس میں متین ہو یا مسخرہ ہر شخص ایک ہی زمرے میں ہے۔ کھانا ہو یا مٹھائی پھل ہو یا حلوا کوئی چیز یہاں اطمینان سے بیٹھکر تنہا نہیں کھائی جاسکتی جب کوئی اس قسم کی چیز کھائی جاتی ہے تو چار دس پانچ ملکر کھاتے ہیں ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کر کھانا اصول لازمی ہے بعض ساحروں کی ٹکڑیاں ناشتہ پر حملہ کرنے کیلئے خاص طور پر نکلتی ہیں ان کو اطلاع ہوئی کہ فلاں دوست کے کمرے میں کوئی نیا طالب علم آیا ہے یا کوئی نو عمر مہمان وارد ہوئے ہیں اور ان کے پاس ناشتہ دان بھی ہے تو اب چاہے ان نو وارد سے ملاقات ہو یا نہو وہ ان کے ناشتہ پر ضرور حملہ کریں گے چنانچہ خبر پاکر دو چار ممبران صاحب کے کمرے میں جن صاحب کے یہاں وہ فروکش ہوئے ہیں داخل ہوتے ہیں اور گپ شپ شروع کرتے ہیں باتیں کرتے ہی کرتے چیزوں کا پتہ لگانا شروع ہوتی ہے ناشتہ دان دیکھا ہوا دیکھا تو کہا بھائی جان اچھی نسبت سے ذرا دیکھیں تو

اندر سے کیسا ہے۔ چنانچہ اُس کے برتن علیحدہ کر کے جو کچھ ہوا کھانا شروع کر دیا
تو نو وارد بھلا چار بھلے مانسوں کو کس طرح منع کرتے یہ کہا بیکر شکریہ ادا کرتے
ہوئے رفوچکر ہوئے یہ طریقہ تو نو واردان کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے لیکن جو
لوگ کہ ملنے والے ہوتے ہیں اُن کے آنے کی خبر پاتے ہی اسٹیشن اور دروازہ
کالج پر ہی اُن کی تلاشی لے لی جاتی ہے اور جس پارٹی کے ہاتھ وہ پڑتا ہے
وہی پارٹی جو کچھ ہوتا ہے ہضم کر جاتی ہے۔

باب ششم

واقعات نفتی

غرضکہ اسی طرح میرا ایک سال کالج کے ان مشاغل میں گذر گیا اور میں نے
تعلیم میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا پھر نئے رنگروٹوں کے بھرتی ہونے کا زمانہ
آگیا اور پھر وہی ہماہمی شروع ہوئی ۱۹۰۵ء میں سوسائٹی کا بنیادی اقدام کیا
اور میں کالج کے احاطے سے اُٹھ کر اسی پایۂ اول بنائی ہوئی کوٹھی میں راجہ
غلام حسین صاحب مجیدی و صاحب فخر الدین بھیا ظہیر کے ہمراہ اس آبادی کو
آباد کرنے کے لئے چلا۔ یہ ایک نہایت نفیس کوٹھی اور ایک باغ کے درمیان
بنی ہوئی ہے۔ بیچ میں ایک بڑا حوض ہے جو [illegible] نوادر لطیفہ
اور اپنے صانع کی صنعت کی یادگار ہے چاروں طرف حوض میں پتھر کے
تراشے ہوئے ناگ کے بنے ہوئے ہیں جو پانی میں زندہ تیرتے ہوئے معلوم
ہوتے ہیں بیچ میں فرشتوں کے بت ہیں کہ جو اپنے سروں پر فوارے کا
پتھری پیالہ اُٹھائے اُس کی صنعت کی خوبی کی وجہ سے آسمان کو اڑا لے

جا رہے ہیں۔ کوٹھی کی چہار دیواری کے ارد گرد پرانے زمانے کے پتھر کہ جن میں بُت تراشے ہوئے ہیں رکھے ہیں۔ یہ وہ پتھر ہیں کہ جو شہر کول کی ایک جگہ کی کھدائی میں سرسید کے ہاتھ لگے تھے اور جو آثار قدیمہ کی یادگار ہیں اس جگہ رکھے گئے ہیں یہی وہ کوٹھی ہے کہ جس کے چاروں طرف بیسوں قسم کی گلاب کی پود تیار کیجاتی ہے اور جس کی وجہ سے علی گڈھ باغ گلاب کے نام سے نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان تک مشہور ہے۔ یہاں کچھ زمانہ تک دیہاتی پنچایت کے اصولوں پر زندگی گذری نہ کوئی حاکم تھا نہ محکوم فرش بچھا ہوا ہے۔ قالین پڑے ہوئے ہیں سماوار گرم ہے۔ قلیان جو کالج کی زبان میں پریسیڈنٹ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ڈٹا ہوا ہے۔ کل ممبران سوسائیٹی ایک ہی جگہ کھانا کھاتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہالیاں تو آبادی کے درمیان منتقل ہو اور میں کے سے نمبر ۲۳ بکی بارک کو منتقل ہو گیا۔

اللہ میاں کا پوتا اس سال ایک صاحب بکی بارک میں پنجاب سے وارد ہوئے کہ جن کا نام عزیز تو یاد نہیں رہا لیکن البتہ یہ یاد ہے کہ اُن کو طلبا ر کالج ‘‘نعوذ باللہ من ذالک’’ خدا کا پوتا ہونے کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ نواب محسن الملک مرحوم نے انہیں بوجہ اس کے کہ اُن کے بزرگوں کے خط صاحب موصوف کے پاس آئے تھے اور نیز بوجہ مراسم ذاتی ہونے کے اُن کو بلا کر اُنکی ضروریات کے متعلق استفسار کیا اس خصوصیت سے اُنھوں نے یہ سمجھا کہ کالج میں میرے ہم پایہ اب کوئی نہیں ہے اور مجھکو چھیڑنے اور تنگ کرنے کی کسی کو ہمت نہیں پڑ سکتی۔ اس لئے آپ ساحران کالج میں کم اٹھتے بیٹھتے اور مذاق کے جلسوں میں شریک ہونے سے احتراز کرتے ساحران کالج نے آپس میں کہا کہ بھائی اِن کے دماغ کی گرمی کا لنی چاہئے چنانچہ اس امر کے

طے کرنے کے لئے شرارت پارٹی کی کیبنیٹ کا خاص اجلاس منعقد ہوا اور یہ
رائے قرار پائی کہ کرکٹ لان کا پانی دینے کا چمڑے کا پمپ لایا جائے اور
اس میں ایک زبردست سٹن پانی پمپ کرنے کے لئے کہیں سے مہیا کر کے
لگایا جاوے اور ٹنکوں میں اس کو لگا کر رات کو ان پر پانی کا فوارہ چلایا جاوے
چنانچہ فوراً ہی اس کے لئے ساز و سامان تیار کیا گیا اور رات کے کوئی گیارہ بجے
جب وہ میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے واٹر بریگیڈئر نے ان پر پانی پمپ کرنا
شروع کیا یہ ہڑبڑا کر اٹھے تو چہرۂ مبارک پر ایک زور سے پانی کا طمانچہ لگا۔ دھلا کر
کمرے کی طرف دوڑے مگر شرارت پارٹی نے جب تک کہ دروازہ بند ہو پمپ
کرنا بند نہ کیا دوسری پارٹی پچھلے دروازے کی طرف کیچڑ لئے کھڑی تھی اس نے
اس طرف سے وہ رسید کی تو پریشان ہو کر وہ دروازہ بھی بند کر لیا اور صبح تک
گرمیوں کی سخت تپش میں حضرت ہال کمرے کے فرش پر کروٹیں بدلتے نظر آئے
صبح ہوتے ہی غصے میں بھرے نواب صاحب کے پاس شکایت کیلئے پہنچے انہوں نے
کچھ سمجھایا کچھ ڈانٹا کہ اگر کالج میں ساحران کالج کی صحبتوں میں حصہ نہ لوگے
تو یہی حال رہے گا جس کا چارہ کار کسی کے پاس کچھ نہیں ہے جب یہ سنا
تو حضرت کی چشم بصیرت کھلی اور چرخ چہارم کے تخیل سے زمین سفلی کی جانب
اتر آئے :-

حساب کا جنازہ ساحرانِ کالج کی خوش قسمتی کہ اس سال یونیورسٹی نے
ایف اے کا کورس بدل دیا اور حساب ایک اختیاری مضمون ہو گیا اس کی
خبر کالج میں جس روز پہنچی ہے تو اتفاق سے بارش خوب ہو رہی تھی اور مختلف
قسم کے برساتی جلوس نکل رہے تھے۔ اس خوشی میں ایک الٹی چارپائی بچھائی
گئی اور اس پر پرانی حساب کی کتابیں مختلف بارکوں کے کمروں سے لا کر

جمادی گئیں۔ اور اُن پر سفید چادر ڈالی گئی۔ خوب پھولوں اور پتوں سے اُسکو سجایا گیا پانچسو چھ سو طالب علم ہولی کھیلتے ہوئے بیہودے ڈھول اور تاشے بجاتے ہوئے جنازے کے ساتھ کرکٹ لان تک پہنچے کچھ لوگ خوب شد۔ حساب مُردہ شد۔ مردہ شد۔ مردہ شد کا نوحہ پڑھتے ہوئے آگے آ گئے تھے۔ کرکٹ لان پر جنازے کے جلوس کا چند عمدہ اور پُر لطف تقریروں کے بعد اختتام ہوا۔

قطرب یہ صاحب سندھ سے تشریف لائے تھے اور ان کی شان میں "دلیل اہل کیف خلقت" کافی ہے جناب کی ہیئت یہ تھی صورت لورانی دھاڑی نورانی۔ قد چھوٹا ثانی۔ دُبلے پتلے۔ مزاج کے چڑچڑے ساحران کالج میں آپ قطرب کے نام سے پکارے جاتے ہیں وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے کورس میں فارسی لی اُس میں کسی موقع پر قطرب کا لفظ آیا آپ نے ساحران کالج میں ایک صاحب سے دریافت کیا کہ قطرب کے کیا معنی ہیں اُس نے کہا کہ ایک جانور ہوتا ہے کہ جو سندھ میں پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے کہا کہ میں نے تو کوئی ایسا جانور سندھ میں نہ سنا اور نہ دیکھا وہ صاحب زیادہ پُر مذاق واقع ہوئے تھے ایک آئینہ کمرے سے اُٹھا لائے اور اُن کے سامنے رکھکر کہنے لگے کہ اب تک نہ دیکھا تھا تو خیر اب دیکھ لیجئے کہ قطرب اس شکل کا ہوتا ہے اِس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور یہ قطرب مشہور ہو گئے۔

قطرب کی کھچڑی ایک روز معلوم ہوا کہ آرچ بولڈ صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا جو حضرت کہ انگریزوں سے میل و ملاقات اور اتحاد کے بہت زیادہ شایق تھے اُن کو یہ فکر ہوئی کہ تعزیت کس طرح کی جائے قطرب بھی پریشان تھے اور لوگوں سے بار بار دریافت کرتے تھے کہ اِس موقع پر کیا ہو۔ دو چار صاحبوں کو اِن کے بتانے کا خوب موقع ہاتھ آیا انھوں نے کہا کہ ہر شخص

کی تشریف ایسے موقع پر اپنے ملک کے رسم ورواج کے مطابق ہوا کرتی ہے۔
اس لئے تمہیں چاہیئے کہ آرچ بولڈ کے یہاں کھچڑی پکوا کر بھیجو۔ کچھ رد وقدح
کے بعد حضرت راضی ہو گئے اور تخمینہ لگا کر مبلغ ڈیڑھ روپیہ ایک صاحب کو
کھچڑی کی طیاری کے لئے حوالہ کیا یار لوگوں نے اس کی کھچڑی پکوائی اور
جب وہ پک گئی تو ایک بہانے سے ان کو کہیں ٹال دیا میدان جب خالی
ہوا تو کمرہ بند کر کے ان ساحروں نے کھچڑی کھانی شروع کی چونکہ حضرت کے
پیٹ میں تو تشریف کا بھوت گھسا ہوا تھا اس لئے تھوڑی ہی دیر میں پھر
آن موجود ہوئے دروازہ اندر سے بند تھا شیشوں میں جھانک کر دیکھا
تو تشریف کی کھچڑی پر لوگوں کے ہاتھ جلد جلد بڑھ رہے ہیں یہ چیخ رہے
ہیں اور وہ نیچی نظریں کئے ہوئے کھچڑی اڑا رہے ہیں آخر کار دروازہ نہ
کھلنے پر گالیاں دیتے ہوئے اور برا بھلا کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوئے
چلے گئے

گز بھر سر گنجشک والا

ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک
جلسہ کے چند صاحب ایک جگہ کھانا کھا رہے تھے اختتام طعام کے بعد
خوش گپیاں شروع ہوئیں اور چونکہ طبی معاملات میں ایں جانب دخل در
معقولات دیا کرتے تھے اس لئے ایک صاحب مذاق میں کہنے لگے کہ کیوں
حکیم صاحب کھانا کھانے کے بعد بھی تو آپ یہ بتا سکتے ہوں گے کہ مریض کا
کیا مرض ہے یا آپ بھی طب کے دقیانوسی اصولوں پہ کاربند ہیں میں نے کہا
کہ ہاں کھانے کا حق چھوڑ کر بتا دیا جا سکتا ہے چنانچہ مذاقاً سب نے نبض دکھانا
شروع کی اور مذاق ہونے لگا قطب صاحب کا جو نمبر آیا تو میری زبان سے
اتفاقاً نکلا کہ بھائی تم تو ختم ہو چکے ہو نسل انسانی کے اضافہ کرنے میں تم
بالکل قاصر ہو اس پر ایک جانب تو قہقہہ پڑا اور دوسری جانب یہ خفا

ہونے لگے۔ بات کی بات میں یہ بھی کہدیا گیا کہ حلوائے گز رمغز سر کنجشک والا
اگر استعمال کیا جائے تو ممکن ہے کہ طاقت پھر عود کر آئے۔ بات رفت
گذشت ہوئی۔ لیکن چار پانچ روز کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ قطرب صاحب
حلوائے گز رمغز سر کنجشک والے کا پارسل لئے چلے آرہے ہیں جناب کا روزمرہ
کا ناشتہ دو انڈے اور چائے تھی۔ اب صبح ہوتے ہی حضرت چھ ماشے حلوا اڑاتے
اور اس کے بعد ۸ بجے حسب معمول ناشتہ کرتے ادھر حلوے کا زور یا ادھر انڈے
اور چائے کا شور گرمی نے اٹھا لیا اور چارپائی پر لمبے لمبے لیٹ گئے۔ بدقسمتی سے
آپ کو سوداویت کی سخت شکایت تھی جس کی تکلیف کی اب انتہا نہ رہی اب تو
سب کو فکر ہوئی اور دہلی چل کر علاج کرانے کی تجویز پیش ہوئی اللہ اللہ کر کے
آپ کو آرام ہوا اور حلوائے گز رمغز سر کنجشک والا موقوف کیا گیا۔

انگریزی مسہل ایک شب کو ایک پی پارک کے سب پراکٹر جو اپنے
اخلاق حمیدہ میں حسن تھے انگریزی مسہل لیا تا می کو جو خبر ہوئی تو صبح چار بجے
اٹھ کر پی پارک کے سب پائخانہ بند کردیئے اور نئے پارک کے پاخانوں کی اندر سے
زنجیر لگا دی ماسٹر صاحب اشد ضرورت سے متاثر ہو کر صبح صبح لوٹا لے پائخانہ
کی طرف بھاگے جس دروازے پر پہنچے بند پایا سمجھے کہ لڑکے حسب معمول
اندر بیٹھے ہیں فوراً نئی پارک کی طرف بھاگے مگر وہاں بھی مضمون واحد نکلا
پھر ادھر کی دوڑ کی اور دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے اور دو ایک
دروازوں پر سختی سے کہا کہ کیا افیون کھا کر بیٹھے ہو مگر وہاں کوئی ہو تو بولے
ایک مجمع ساحران کا لوٹے لئے ہوئے باہر اس مشغلہ کے دیکھنے کو کھڑا ہوا
تھا جب آخر ضبط کا یارا نہ رہا تو نالی ہی پر بیٹھ گئے اور سب یاران طریقت
کھلا کھلا کر ہنس پڑے جب ماسٹر صاحب پر حقیقت حال کھلی تو سر کا

جبن نوروز اول سے ہی تھے مگر اتنو بارہ برس کے پرانے سرکے کی طرح تیزی دکھانے لگے۔ مگر معاملہ خاموشی سے رفت گذشت ہو گیا۔

گورکھپوری آم یکی بارک کمرہ نمبر ۲ میں جانفذ بگی کا جائے مسکن تھا۔ ان کے ہاں گورکھپور سے قلمی آم کا پارسل آیا ان حضرت نے نہ دیگر دوستوں کا خیال کیا اور نہ پڑوسیوں کا۔ ایک خفیہ نوٹس لکھا یا اور صرف اہل گورکھپو کو مدعو کیا شرارت پارٹی کو اتفاق سے پتہ لگ گیا سب نے یہ تجویز کی کہ وقت مقررہ پر یکے بعد دیگرے کمرہ نمبر ۲ پر پہنچ جاؤ چنانچہ ابھی سب گورکھپوری جمع بھی نہ ہونے پائے تھے کہ وہاں نہ ماں میں ترا مہمان اک مجمع کا مجمع پہنچ گیا اب تو یکی صاحب بہت پریشان ہوئے اور ٹکاٹک دیدم دم نکشیدم کی تصویر بن گئے جب کچھ دیر تک سکوت کا عالم رہا تو ایک صاحب یکی کے کمرہ میں پانی پینے کے بہانے پہنچے اور آم کا کھانچہ اٹھا برآمدے میں لاکر رکھدیا اور "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے" کی صدا لگادی دم بھر میں آم سب صاف تھے یہ بہت کودے اچھلے۔ بگڑے بغرائے مگر آخر خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین پر فقرہ ڈاکٹر ضیاءالدین جو اسی درس گاہ کے ہونہار طالب علم تھے جب جرمن اور انگلستان کی حساب کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر کے ہندوستان آئے اور محمڈن کالج میں ان کا پروفیسری پر تقرر ہوا تو اس وقت اس وجہ سے کہ جو ڈگریں انھوں نے لی تھیں اور جو قابلیت کی تھی انھوں نے حاصل حساب۔ اور جنکی عزت اس زمانے میں صرف معدودے چند ہندوستانیوں کو حاصل تھی بڑی قدر و منزلت اور آؤ بھگت سے ان کا کالج میں استقبال ہوا جدت طبع پارٹی نے ان کی حساب دانی پر کیا خوب پھبتی کہی ہے۔

دعوے بہت بڑا ہے ریاضی میں آپکو
طول شب فراق ذرا ناپ دیجئے

مولانا کی مرغابیاں

کالج کے ڈین نے ایک روز مرغابیاں خریدیں اور اُن کو مسجد کے حوض میں چھوڑ دیا کچھ مذاق پسند صاحب نماز کو آئے تو مرغابیوں کو دیکھکر اُن کے منہ میں پانی بھر آیا مشورہ ہوا کہ رات کو ان کو عالم بالا پر پہنچا دیا جائے چنانچہ شب میں جاکر اُنہیں چپکے سے پکڑ لائے اور ذبح کر کے صبح ناشتے کیساتھ خوب مزے مزے سے کھایا صبح کو جو ڈین صاحب نماز کو آئے تو مرغابیاں ندارد تھیں تفتیش شروع ہوئی تو شرارت پارٹی کے ایک ممبر کیا فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب حوض میں پانی کم تھا غالباً پانی کی تلاش میں باہر کے کنوئیں میں چلی گئی ہونگی مولانا نے تلاش میں ہرکارے چھوڑے مگر مرغابیاں تو دوسرے کنوؤں میں پیر پھیلائے سو رہی تھیں اُن کا بھلا کیا پتہ چلتا بیچارے خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔

قانونی پروفیسر کا چٹکلا

کالج میں قانون کے پروفیسر نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھے قانون میں خاص دستگاہ رکھتے تھے اور درس دینے میں اُن کو خاص ملکہ اور دلچسپی تھی لیکن باوجود متانت اور سنجیدگی کے تمسخر کی آپ پڑیا تھے چنانچہ ان کے دو قصے قابل ذکر ہیں۔

سوہن لال

یہ ایک قانونی طالب علم تھے اِن کا گھر رسل گنج میں واقع ہوا تھا سوسائٹی سے جہاں قانونی درجہ ہوا کرتا تھا یہ دو فرلانگ پر واقع تھا یہ صاحب جب پڑھکر نکلتے تو پروفیسر صاحب کی گاڑی کا طواف کیا کرتے اور ہمیشہ اس کے آرزومند رہتے کہ پروفیسر صاحب اُن کو اپنی گاڑی میں بیٹھا کر اُن کے گھر چھوڑ دیتے ہوئے کہ پروفیسر صاحب

راستہ میں پڑتا تھا اپنے گھر جو پون میل پر واقع تھا جایا کریں۔ جب یہ طوائف گاڑی کنی روڈ تک ہوتا رہا تو پروفیسر صاحب ان کے عندیہ کو سمجھے۔ انہوں نے کہا مسٹر سوہن لال آیئے میرے ساتھ گاڑی پر چلیے اِن کی تو یہ آرزو ہی تھی۔ جھٹ بیٹھ گئے جب گاڑی اِن کے مکان کے قریب پہنچی تو آپ فرمانے لگے کہ میں یہیں اُتروں گا پروفیسر صاحب جواب دیتے ہیں کہ مسٹر سوہن لال اِس گھوڑے میں یہ عیب ہے کہ جب یہ چلتا ہے تو سیدھا مکان ہی پر رُکتا ہے اِس لئے میں مجبور ہوں۔ چنانچہ قہر درویش بجان درویش بیچارے اُن کے مکان پر اُترے اور پھر پون میل کی پا پیادہ مسافت طے کر کے اپنے مکان پر پہنچے اُس دن سے پھر باوجود پروفیسر صاحب کی درخواست کے بھی سوہن لال نے گاڑی میں بیٹھنے کا نام نہ لیا۔

ماموں ایک طالب علم جو ماموں کے لقب سے کالج میں مشہور تھے اور جو اُس زمانے میں قانونی درجہ میں پڑھتے تھے بہت سخت محنتی اور بدھو واقع ہوئے تھے لیکن جس وقت کہ عالمِ بالا میں عقل تقسیم ہو رہی تھی اِس وقت یہ صاحب غیر حاضر تھے شاید آخر میں پہنچے ہوں تو پہنچے ہوں اِن کی اُسی زمانہ میں شادی ہوئی اور شادی کے تیسرے ہی روز کالج میں آوارد ہوئے۔ ساتھیوں نے استفسار حال کیا تو معلوم ہوا کہ اُن کی شادی اُن کی اک رشتہ کی بھانجی سے ہوئی ہے یارانِ طریقت کو موقع ہاتھ آیا اور فوراً ہی برجستہ فقرہ چست ہوا کہ شرع محمدی کی رو سے بھانجی سے شادی قطعاً ناجائز ہے چنانچہ دو ایک نے فوراً اُس کی تائید میں شرع محمدی پیش کر دی اُس وقت بیچارے خاموش ہو گئے لیکن دوپہر کو شرع محمدی کا مطالعہ شروع ہوا اور پھر جب اپنے پاس کی کتابوں سے اطمینان نہ ہوا تو کتب خانے گئے اور وہاں ہر مصنف کی

شرع محمدی کی ورق گردانی شروع کی جسکو دیکھا اُس میں یہی نکلا کہ بھانجی سے
شادی قطعًا ناجائز ہے اب تو اِن کو بہت تشویش ہوئی اور سخت گھبرائے
ہوئے قانونی پروفیسر کے دربدولت پر پہنچے۔ سوال سنتے ہی وہ تاڑ گئے
کہ ساتھیوں کا کوئی فقرہ کارگر ہوگیا انہوں نے بھی جواب میں وہی کہا کہ جو
اُن کی امید کے خلاف تھا جب ہر طرف سے یہی جواب ملا تو حیران و پریشان
دارالاقامہ پہنچے اور گھر جانے کی عجلت سے طیاریاں ہونے لگیں جب
اسباب بندھ چکا تو شرارت پارٹی کے ایک ممبر نے دوسرے سے کہا کہ میاں
شرع محمدی میں تو حقیقی بھانجی سے شادی ناجائز ہے اگر کسی رشتے کی وہ
بھانجی ہے تو کوئی امر مانع نہیں پہلے تو سن کر اس کا یقین نہ آیا لیکن جب
کتابیں دکھائی گئیں تب آپ کو اطمینان ہوا اور بُرا بھلا کہتے ہوئے اسباب کھلوڈالا

اعجازی نکتہ کچھ عرصہ کیلئے قانونی پروفیسر چھٹی پر گئے اور ایک اور
بیرسٹر صاحب جو کالج کی زبان میں بھیوں کے سردار ہونے کے قابل تھے
اپنے قانونی معجزے دکھانے کیلئے متعین ہوئے۔ تعزیرات ہند کا سبق ہوتا
تھا اور آپ اُس کے پڑھانے میں اعجاز سے کام لے رہے تھے۔ کسی آلہ
دھاردار سے ضرب دیئے جانے کے جرم کا تذکرہ تھا اور اُس پر انسٹرومنٹ
(آلہ) کی مثالیں دی جا رہی تھیں۔ ایک طالب علم کو جو مذاق سوجھا تو اُس نے
سوال کیا کہ پروفیسر صاحب اگر نگوشئبل انسٹرومنٹ (قانون کی ایک کتاب)
ہو تو کیا جرم ہوگا تو آپ فرماتے ہیں کہ غالبًا وہی جرم ہے کہ جو تیز دھار
آلہ کی استعمال کا جرم ہے۔

ڈین پر فاتحہ ایک روز شرارت پارٹی کی کیبنیٹ میں یہ امر پیش ہوا
کہ طلبا اور متحلقات منتظمین دارالاقامہ کے فاتحہ اڑائی جا چکی ہے۔ لیکن

افسوس اس امر کا ہے کہ مسجد کی طرف ایک نے بھی کبھی رخ نہ کیا۔ نعوذ باللہ من
ذالک اللہ میاں کو یہ شکایت ہوگی کہ ہمارے مقبول بندے کی طرف کسی نے بھی توجہ
نہ کی۔ اس لئے آج چلو اور تقدس مآب ولی کامل ناظم دینیات پر فاختہ اڑائی جائے
اور ان کو یہ کہا جائے کہ عالم سفلی میں کیا کیا ہوتا ہے چنانچہ ایک صاحب جو بمبئی
سے آئے تھے اور جو ملا کے خطاب سے پکارے جاتے تھے اور کالج کے قابل ترین
طالب علموں میں سے تھے نیز یونین کے مشہور مقرر تھے رہبری کے لئے تیار ہو گئے
وہ اور اور چند ساحر باب العبادت سے صحن مسجد میں داخل ہوئے اور ایک ایک
محافظ باب العبادت اور باب الزیارت پر تعینات کیا گیا مولوی صاحب اور
ان کے ایک مصاحب صحن مسجد کے چوکوں کے فرش پر پلنگڑیاں بچھائے
بہت ہی آرام سے خواب و خرگوش کے مزے لے رہے تھے کہ تین ساحر ول نے
تین کوری ٹھلیاں کہ جو کنارے حوض پر ٹھنڈے پانی سے لبریز رکھی تھیں اٹھا کر
چارپائی کے پاؤں سے اس زور سے ٹکر ماریں کہ دونوں صاحب مارو یا
مارو یا کہکر چیخنے لگے یہ دیکھکر بندگانِ عالی تو اپنی اپنی چار پائیوں پر آکر اور چادر
تان کر چپکے سے لیٹ رہے اب ناظم صاحب کو جو ہوش ہوا تو فوراً سب
پراکٹروں کو جگایا گیا اور کل واقعات کہکر بغرض تفتیش روانہ ہوئے چند اور
خدا کے بندے فاختہ اڑا نے کبھی بارک گئے ہوئے تھے اور ان کے بستر خالی
پڑے ہوئے تھے ان کے نام لکھ لئے گئے اور صبح کو ان اصحاب کے ناموں کا
اور اضافہ ہوا جو اس قسم کی شرارتوں میں بدنام تھے نواب وقار الملک کو
رپورٹ ہوئی اور چونکہ نواب صاحب موصوف مولوی صاحبان کو ایک
بہت ہی تقدس کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں یہ سنتے ہی بگڑ گئے اور با قاعدہ
خفیہ و علانیہ تحقیقات شروع ہوئی لیکن مجرموں کا پتہ نہ چل سکا اور آنکواری

کمیشن کی بھی رائے قائم ہوئی کہ کالج میں اُس روز چند چور آ گئے ہونگے جو یہ حرکت
کر کے چلے گئے۔ اس پر دربانوں اور چوکیداروں کو سخت ہدایت ہوئی کہ نہایت حفاظت
سے پہرہ دیں +

باب ہفتم

شورش ۱۹۰۷ء

۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۷ء کے شروع تک اسی طرح بسر ہوتی رہی کہ فروری ۱۹۰۷ء
میں وہ سخت واقعہ پیش آیا کہ جس سے کالج کی زندگی اور اُس کی اعلیٰ اور ادنیٰ پالسی
میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ مواد تو ایک زمانے سے جمع ہو رہا تھا لیکن فروری
۱۹۰۷ء میں اس کو پھوٹ کر نکلنے کا موقع ملا۔ ہر انقلاب کیلئے یہ امر ضروری ہے کہ
پہلے سے مواد واقعات کی بنا پر جمع ہوتا رہتا ہے اور اُس کے ہو جانے کے لئے
ایک معمولی سی فوری وجہ ہو جاتی ہے بیشتر اس کے کہ اس واقع کا تذکرہ کیا جائے
یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں تاریخ تعلیم انگریزی پر ایک سرسری نظر ڈالوں۔ اور یہ
دکھلاؤں کہ کالج کن حالات اور واقعات میں قایم ہوا تھا اور اب اُس کے
گرد و پیش کیا واقعات موجود ہیں یہ امر دکھانا کہ اس انقلاب عظیم کے کیا اسباب
ہوئے اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اُن لوگوں کی پالسی اور اُس کے
تبدل و تغیر پر ایک نظر نہ ڈالی جائے کہ جن کے ہاتھ میں کالج کی تعلیمی باگ ہے
لہٰذا میں تاریخ تعلیم انگریزی کو پہلے لیتا ہوں اٹھارھویں صدی کے آخر میں
مسلمانوں کا سیاسی۔ علمی۔ اور معاشرتی تنزل اس درجہ پہ پہنچ گیا تھا کہ جس کو
دیکھتے ہوئے یہ یقین ہوتا تھا کہ ہندی مسلمان اب کبھی ترقی نہ کر سکیں گے

ہند سے اسلامی سلطنت جاتے ہی مسلمانوں کی حالت ایسی ابتر ہوگئی تھی کہ گویا سلطنت ایک زرکار مرصع جھول تھی جسکے اُتر جانے سے اصلی حالت ظاہر ہوگئی مسٹر چارلس گرانٹ ڈائرکٹر ایسٹ انڈیا کمپنی و ممبر پارلیمینٹ نے اپنے مشہور رسالے ۱۷۹۲ء میں مسلمانوں کے اس تنزل کا خوب خاکہ اڑایا ہے (وہ خاکہ جیسا کہ عام طور پر ہمارے مغربی مستشرق صرف سطحی واقعات پر ایک عالیشان محل بنا کر کھڑا کرتے ہیں اور اصلیت کوسوں دور ہوتی ہے) سطحی اور واقعات پر مصبرانہ نظر نہ ڈالنے پر محمول ہے لیکن کم سے کم اس سے اس امر پر ضرور کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے کہ اُس زمانہ میں مسلمانوں کی بدیہی حالت کیا تھی۔

ہندی مسلمانوں کی ایسی حالت کا ہو جانا کچھ تعجبات سے نہ تھا اس لئے کہ یہ امر ہرگز دل سے محو نہ ہونا چاہئے کہ سیاسی انحطاط اور زوال بدامنی پیدا کرتا ہے بدامنی معاشرتی شیرازے کو پراگندہ کر دیتی ہے اور اطوار محسوسات اور امنی ادراک جاتے رہتے ہیں اس میں ہرگز شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہر ایک قوم کا سیاسی زوال اس کے اخلاقی، علمی اور معاشرتی زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے بجنسہ یہی حالت مسلمانوں کی ہوگئی تھی۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہند میں یورپی حکومت کا پھریرا نصب ہو چکا تھا اور نئے خیالات اصول سیاسی اور طرز معاشرت کا سیلاب امنڈا چلا آتا تھا ہندوستان کی علمی حالت اگرچہ بہت ہی گری ہوئی تھی اس پر بھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہند کی حکومت میں قدم رکھتے ہی یہی مناسب اصول سیاسی اختیار کیا کہ ہندوستانیوں کو قطعی جاہل رکھا جاوے اور تعلیم رعایا کو اپنے فرائض منصبی سے نکال باہر کیا چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی علمی پالیسی کا دیوان خاص کی منتخب کمیٹی کے سامنے مسٹر جان کلارک مارشمین نے بدیں الفاظ

۱۵۔جون ۱۸۵۳ء کو اظہار کیا۔ ہندوستان میں برٹش راج کے مستحکم ہونے پر ایک
عرصہ تک ہندوستانیوں کو کسی طریقۂ تعلیم دلانے پر بڑی مخالفت رہی۔ اس
ملک میں پبلک اتھارٹیز کے خیالات کی جانچ اس مسئلہ میں سب سے پہلے ۱۷۹۲ء
میں ہوئی جبکہ مسٹر ولبیتھ فورتھ نے اُس سال کے چارٹرایکٹ میں دو دفعہ شامل
کرنے کی درخواست پیش کی جن میں سے ایک یہ تھی کہ ہندوستانیوں میں سکول
ماسٹر بھیجے جائیں کورٹ آف پروپرائٹرس میں اس کی نہایت سخت مخالفت
ہوئی اور یہ دونوں دفعات واپس لینے پڑیں۔ اس تجویز کی وجہ سے ایک
یادگار مباحثہ جس میں سب سے پہلے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے تعلیمی مسئلہ پر
اپنی رائے کا اظہار کیا ہو۔ اُن میں سے ایک نے اُس موقع پر کہا "کہ ہم ابھی
اپنی بے وقوفی سے امریکہ کو اپنے ہاتھ سے نکال چکے ہیں اور یہ وہ بے وقوفی
تھی کہ ہم نے وہاں اسکول و کالج قایم ہونے کی اجازت دی اور ہمارے
نزدیک اس بے وقوفی کا ہندوستان میں اعادہ کرنا عقلمندی نہیں ہے"
یہ وہ منظر پالسی تھی کہ جس نے عام طور پر کل ہندوستانیوں کو اور خصوصاً ان کے
ایک حصے یعنے مسلمانوں کو تعلیمی دوڑ میں پیچھے کردیا اس میں کوئی شک نہیں
کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے سیاسی فائدے کے سامنے رعایا کی علمی فلاح
کا مطلق خیال نہ کیا اُس کے خیال میں رعایا کو جاہل رکھنا استحکام سلطنت تھا
مگر مسٹر گرانٹ نے ایک اسکیم ہندوستانیوں کے علمی معاشرتی احیاء کیلئے تجویز کی اور
اُس میں دکھلایا کہ سلطنت کا اخلاقاً فرض ہے کہ تعلیم انگریزی کو ہندوستان
میں مروج کرے اور یہ کہ اس میں کوئی سیاسی خطرہ نہیں ہے۔ اُس نے
دلایل سے ثابت کیا کہ اصلی استحکام سلطنت یہی ہے اور آئندہ حاکم و محکوم کے
ارتباط باہمی کے استحکام کے لئے یہ امر اشد ضروری ہے مگر اس اسکیم

بیسیوں اعتراض ہوئے جن میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جو اس زمانے کے سرکاری افراد کے خیالات اور پالیسی کا آئینہ ہے اور وہ یہ ہے "اگر انگریزی زبان اگر انگریزوں کی رائے اور ترقیات ہمارے ایشیائی مقبوضات میں خصوصاً بنگال میں جاری کی جائیں . . . . اور اگر ان تمام تبدیلیوں کیساتھ بہت سے انگریز یہاں بود و باش اختیار کریں تو کیا یہاں کے لوگ انگریزی آزادی اور انگریزی طریقہ حکومت کی خواہش نہ کریں گے کیا وہ ملک کے قوانین بنانے میں حصہ لینے کے خواہش مند نہ ہوں گے اور کیا ملکی فوج کے اعلےٰ عہدے حاصل نہ کریں گے کیا ایک عرصہ میں صوبہ کی فوج ہندوستانیوں کی ماتحت نہ ہو جائے گی جس سے حکومت اعلیٰ کا کچھ زیادہ لگاؤ نہ ہوگا اور آخر کار یہاں کے باشندے کیا غیر ملک کے محکوم ہونے اور خراج دینے کو سختی خیال نہ کریں گے اور آخر میں کیا وہ اطاعت سے منحرف نہ ہو جائیں گے اور اپنی خود مختاری کو حاصل نہ کرنا چاہیں گے "۔ یہ ہیں وہ خیالات جو اس زمانے کے انگریزوں کے ہندوستان کی تعلیم کے متعلق تھے مسٹر گرانٹ کی اسکیم پر دیگر مدبروں نے بحث کی اور اپنے دلایل سے اس امر کو ثابت کر دکھایا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینا حکومت کا ایک لازمی فرض منصبی ہے آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ ۱۷۸۱ء میں بزمانہ وارن ہسٹنگ معزز مسلمانوں کی درخواست پر ایک مدرسہ جو کلکتہ مدرسہ کے نام سے مشہور ہے جاری کیا لیکن یہ صرف مشرقی علوم قدیم کی تعلیم کے لئے جاری کیا گیا تھا اس کے بعد لارڈ منٹو نے سنہ ۱۸۱۲ء میں مسلمانوں کی تعلیم پر اظہار رائے کیا سب سے پہلے ایکٹ جو تعلیم کے لئے پارلیمنٹ میں پیش ہو کر پاس ہوا وہ ایکٹ ۱۵۵ سیکشن سی تھرڈ - ایٹ جارج - تھرڈ ۵۳ سے پن تھا مگر جنگ نیپال اور دیگر انتظام سلطنت کی وجہ سے اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

اُنیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی یہ اہم مسئلہ پیش ہوا کہ آیا تعلیم مغربی کا رواج ہونا چاہئیے یا کہ قدیم علوم مشرقیہ کا احیاء۔ مسلمان بالعموم احیاء علوم مشرقیہ کے مؤید تھے اور انگریزی تعلیم سے بالطبع متنفر۔ یہ تنفر مختلف وجوہات پر مبنی تھا اکثر اس لئے مخالف تھے کہ مذہبی تعلیم کا انگریزی تعلیم کے ساتھ مدارس میں موجود نہ ہونا اور انگریزی تعلیم کا تیمہ اثر خصوصاً مذہب سے لاپرواہی پیدا کرنا مسلمانوں کیلئے مضر ہے درحقیقت ایک خاص اور بڑا خیال جو اُس وقت مسلمانوں کے دلوں میں جاگزین تھا یہی تھا ورنہ دیگر خیالات بہت خفیف اثر رکھتے تھے چنانچہ بعض کہتے تھے کہ سرکاری مدرسوں میں اخلاق و عادات خراب ہو جاتے ہیں مسلمان اُستاد دنکی سرکاری مدرسوں میں بہت کم تعداد ہے سرکاری طرز تعلیم ناقص ہے سرکاری مدرسوں میں حقیقی تعلیم میں ترقی کی کمی ہے مجملاً یہ مختلف گروہوں کے مختلف خیالات تھے۔ غرضیکہ کسی بنیاد پر مخالفت ہو مسلمان بالعموم انگریزی پڑھنے سے بھاگتے تھے اور علوم مشرقیہ کا احیا چاہتے تھے۔

اہل ہند کی بدقسمتی کا یہ دورہ ۱۸۳۵ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں قایم رہا۔ آخر کار ایک مدبر خود اُن کی جماعت سے پیدا ہوا جس کا نام وولاز ڈمیکالے تھا۔ جو ہیں کہ وہ ہند میں وارد ہوا اور کمیٹی کا صدر مقرر ہوا اُس نے کام کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک کہ گورنمنٹ یہ فیصلہ نہ کر دے کہ آیا مغربی علوم کی تعلیم ہند میں ہونی چاہئیے یا نہیں وہ اِس میں ہاتھ نہ لگائے گا چنانچہ دوسری فروری ۱۸۳۵ء کو اُس نے اپنی مشہور یادداشت پیش کی اور اُس نے کمیٹی کے اُس حصے کی تائید کی کہ جو مغربی تعلیم کا مؤید تھا۔ اُس نے کہا "مجھے اُس کام میں تقویت دینا ہوتی ہے جس کی نسبت مجھے یقین ہے کہ وہ صرف دھوکا ہے مجھے کامل یقین ہے کہ موجودہ بندوبست سچ کی ترقی کرنیکی طرف

نہیں ہے" یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سرکارِ انگریزی نے اس وجہ
سے کہ مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف تھے کچھ زیادہ توجہ نہ کی اور اُن کو تنہا انقلاب
کے منجدھار میں چھوڑ دیا۔ تعلیم انگریزی کے متعلق جس قدر کمیٹیوں کی رائے لی گئی
اُس میں مسلمانوں کا تذکرہ تک نہ تھا اور صرف ہندوؤں کی تعلیم کی بابت دریافت
طلب امور طے ہوتے تھے گویا مسلمان نہ ہندوستان کے باشندے تھے اور نہ
سرکار کی رعایا۔

سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی نکبت کا خیال ارل آف منٹو کو ہوا۔ کہ جس نے
مورخہ ۷ اگست سنہ ۱۸۱۱ء کے زیر ریزولیشن نمبری ۳۳ کو پاس کیا اور اس کے بعد
مختلف صوبوں کی سرکاروں نے اس طرف توجہ مبذول کی۔ سنہ ۱۸۴۵ء میں جاکر
گورنمنٹ کو خیال ہوا کہ ہندوستان میں یونیورسٹیاں قایم کی جائیں چنانچہ سنہ ۱۸۵۳ء
میں پارلیمنٹ نے ہندوستان کے معاملات طے کرنے کیلئے تہیہ کیا اور سنہ ۱۸۴۵ء میں
جو اسکیم کلکتہ یونیورسٹی کے لئے طیار ہوئی اُس کے آخری الفاظ یہ ہیں "یونیورسٹی
اکسفورڈ اور کیمبرج کے تمام قوانین اور لنڈن یونیورسٹی جو حال میں قایم ہوئی ہے
اُس کے قوانین کو بغور دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کیلئے
یونیورسٹی لنڈن زیادہ موزوں ہے" یہی وہ بنیادی غلطی تھی کہ جس نے ہندوستان کی تعلیم
اور ہندوستانی کی دماغی قوت اور جوہر کا ناس لگا دیا ورنہ ہندوستانی آج
علمی اور دماغی ترقی اور اُن ترقیوں میں جن میں علم و عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے
پیچھے نہ رہتے ہندوستانی اس وقت اس قدر تعلیم یافتہ نہ تھے کہ اُس کی مضرتوں کو
سمجھتے اور فیصلہ غیروں کے ہاتھ میں تھا نہ صرف یونیورسٹی آف لنڈن کے نمونے
پر ہندی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں بلکہ یہاں تک ہوا کہ قوانین نصاب تعلیم اور
طریقۂ امتحانات وہ اختیار کیا گیا کہ جس سے صرف سرکاری کلرک پیدا ہو سکیں

اور اصلی تعلیم اور علم کا نام تک نہ ہو۔

سرکاری تعلیم گاہوں کی ناکافی اور غیر مفید تعلیم کے متعلق سر گرو داس بنرجی بھی جو مسئلہ تعلیم کے مسلمہ ماہر ہیں رائے ہے کہ موجودہ یونیورسٹیوں کا طریقہ تعلیم ناقابلِ اطمینان ہے مسٹر بک پرنسپل علی گڈھ کالج اسی مسئلہ کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سرکاری کالجوں کے طالب علم کا مقصد صرف طوطے کی طرح امتحان کیلئے سبقوں کا رٹ لینا ہے اور بس۔ خود گورنمنٹ آف انڈیا نے جو رزولیشن ۱۹۰۴ء میں مسئلہ تعلیم کے متعلق پاس کیا اس میں موجودہ یونیورسٹیوں کے معائب اور نقائص کا اعتراف کیا ہے۔

ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے سے مجھکو صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ چاہے کیسی ہی دلدہی کرنے اور فلاح رعایا چاہنے والی گورنمنٹ کیوں نہ ہو حقیقی تعلیم اس وقت تک کسی قوم کو حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ شعبۂ تعلیم کلیتاً قوم کے ہاتھوں میں نہ ہو متذکرۂ بالا واقعات سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ انگریزوں کی ایک جماعت اس کی مؤید تھی اور رہی ہے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے اور اُن کو علوم و فنون مغربی کی چاشنی کا ذائقہ چکھایا جائے اور سوائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شروع شروع کی پالسی کے گورنمنٹ برطانیہ کوشش کرتی رہی ہے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل ہو اور اب تک بعض ارکانِ سلطنت ہندوستانیوں کے اعلےٰ تعلیم کے مؤید رہے ہیں مگر پھر بھی ہر گورنمنٹ کے ساتھ سیاسی تعلقات وابستہ ہیں۔ اور وہ سیاسی معاملات کی بنا پر اکثر ان مفید تجاویز پر عملدرآمد نہیں کر سکتی کہ جو اُس کے ارکانِ سلطنت کے نزدیک اُس کے سیاسی پالسی کے نقیض ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک گورنمنٹ کو اس میں معذور سمجھنا چاہئے لیکن اسی کے ساتھ فقط قوم کو یہ احساس لازم ہے کہ وہ

اپنی تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لے۔ اور گورنمنٹ کو اس بار سے سبکدوش کرے ان
بُرائیوں کو دیکھتے ہوئے ۱۸۷۲ء میں چند درد خواہ مسلمانوں نے بسر داری
سرسید احمد خاں اِس دارالعلوم کی بنیاد ڈالی تاکہ سرکاری تعلیم گاہوں سے مختلف
قسم کے لوگ پیدا کر سکے اگرچہ تعلیم و تربیت مسلمانان ہند کے لئے یہ ایک
غیر مترقبہ چیز تھی لیکن باوجود اِس امر کے بھی تعلیم کا وہ منشا اور منتہائے خیال
جو مسلمانوں کا تھا اس کالج سے نہ نکلا کیونکہ یہ کالج بھی نصاب تعلیم طریقہ امتحانات
اور انتظام میں سرکاری یونیورسٹیوں کے ماتحت رہا۔

متذکرہ بالا واقعات سے یہ اظہر من الشمس ہے کہ جس زمانہ میں کالج قایم ہوا تھا
اُس زمانے میں عام طور پر مسلمانوں کی حالتِ علمی نہایت خراب تھی اور ایسٹ انڈیا
کمپنی کے دور کے بعد اکثر یورپین اہل الرائے مسلمانوں کی تجاویز علمی میں ساتھ
ساتھ رہے اور خود گورنمنٹ کی پالسی بھی اِس کی تائید میں تھی چنانچہ سرسید مرحوم کے
زمانے میں جو پرنسپل اور پروفیسر مقرر ہو کر آئے تھے وہ اِس کام کو اپنا ہی
کام سمجھ کر انجام دیتے تھے اور وہ اِس کا احساس رکھتے تھے کہ وہ ایک قوم کے
تنخواہ دار ملازم ہیں اور اُن کو بلا تفریق قومیت و مذہب وملت اس کی بہبودی
و فلاح میں ہمہ تن کوشش لازم ہے مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور تعلیم کے
اثر سے مسلمانوں میں اپنی فلاح اور بہبودی کے سوچنے اور حفاظت حقوق
خیالات دل میں جاگزیں ہوتے گئے تو ادھر دوسری جانب انگریزی پروفیسروں
میں یہ درج کہ وہ حاکم وقت ہیں اور یہ خیال کہ ہندی ابھی تک ہمارے
سامنے نیم وحشی ہیں پکڑتا گیا۔ جس کی بنا پر ایک طرف تو ٹرسٹیاں مدرسۃ العلوم
اور خاص طور پر انڈین اسٹاف اور طلبا کالج کو اپنے سے کم درجے کا سمجھنے
لگے۔ اور اِس امر کی کوشش کرنے لگے کہ اُن کے مزاج اور اُن کی تہذیب

اور پالسی کی اندھا دھند تقلید کرنا مسلمانان ہند کا فرض عین ہے۔ اور بلا خیال
اِس امر کے کہ اُن میں قومی روح کہ جو زندہ اقوام کیلئے ضروری ہے اور اعلےٰ تعلیم
کا مذاق اُن میں پیدا ہو یا نہ ہو لیکن وہ مغربی نکتہ خیال کے محور پر بلا کسی امر کے
سوچے کے گھومنے لگیں اور اس پالسی کی وجہ سے کالج علمی حیثیت سے نکل کر
ایک قسم کا پولیٹیکل دنگل بن گیا اور وہ مفید باتیں جو حقیقی تعلیم کے انکشاف کیلئے
ضروری تھیں پس پشت ڈال دی گئیں اِس کا آغاز تھیوڈر مارلین کے
آخری زمانے سے ہوا اور خاص طور پر اُس وقت سے کہ جب وہ امپیریل
کونسل کے ممبر ہوئے۔ اگرچہ جو واقعات اب میں بیان کروں گا وہ اول
اول چھوٹے اور ہیچ نظر آویں گے لیکن جو اثر کہ اُن کا کالج کی زندگی پر پڑا
وہ ایک عظیم الشان اثر ہے آخری زمانہ پرنسپلی میں مارلین صاحب کا
رویہ ہج کی ملاقات میں یہ ہو چلا تھا کہ وہ اکثر طالب علموں سے مکان پر ملنے
میں تعرض کرنے لگے اور وہ ملاقات کا اِس طرح وقت مقرر کرتے تھے
کہ جب وہ چار بجے شام کو یا کسی وقت صبح کو اپنے بنگلے سے بغرض سیر یا
دورہ کالج کے لئے روانہ ہوتے تو طالب علم نمبر ایک سے بنگلے کے دروازہ
پر نمبر دو سے کچی بارک کے دروازہ پر نمبر تین سے مسجد کے دروازے کے
سامنے اور نمبر چار سے کرکٹ لان پر ملاقات کرتے اِس طرز ملاقات نے
لڑکوں پر یہ اثر کیا کہ اُنھوں نے یوروپین اسٹاف کے ممبروں سے ملنا ترک
کر دیا اور یوروپین اسٹاف کے دیگر ممبروں پر اُس کا یہ اثر ہوا کہ اُن کا رویہ
اخلاق و ہمدردی کے شارع سے ہٹ گیا اور جانبین کی طرف ایک دوسرے
سے مغائرت کا اظہار ہونے لگا اُسی زمانے میں عربی اسکیم پر کہ جس کے
مسٹر مارلین بڑے مؤید تھے یونین میں مباحثہ ہوا۔ اسکیم اگرچہ ظاہرا بہت

خوشنما معلوم ہوتی تھی مگر واقعات کے لحاظ سے یہ وہ اسکیم تھی کہ جو علیگڈھ کالج کی بنیاد کی اور اُس اصول ترقی کی کہ جسکو سیدا اور دیگر رہبران قوم نے اپنے لئے راہ راست تجویز کی تھی جڑ کاٹنے والی تھی گویا اک شربت کے گلاس میں زہر ہلاہل دیا جا رہا تھا کہ جس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک رہبر قوم مفصلہ ذیل الفاظ میں اپنا اظہار رائے کرتے ہیں :-

"زبان صرف ذریعہ ہے انسان کے خیالات ظاہر کرنے کا اور جب انسان کے خیالات درست ہوتے ہیں اُس کی اندرونی طینت تعلیم یافتہ ہو جاتی ہے اور اُس کو ہر قسم کی معلومات علوم کی اور واقعات کی اور انسانی طبیعت کی حاصل ہوتی ہے تب اُس کے خیالات علمی پیرایہ حاصل کرتے ہیں اور جب وہ کسی زبان میں ادا کئے جاتے ہیں تو وہ اُس زبان کا علم ادب کہلاتا ہے اُس کی ترقی سے انسان کی ترقی ہوتی ہے مگر جب مشرقی لیٹریچر ان سب امور سے خالی ہے تو اُس کی ترقی دینے کا مفہوم ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا بجز اس کے کہ ہم دھوکے میں رہیں اور حقیقت تک نہ پہنچیں" حسن اتفاق سے اِس اسکیم کی مخالفت کی سمجھ طلبا کالج میں فطرتاً پیدا ہوئی اور یہ اسکیم یونین میں پاس نہ ہوئی جس کی وجہ سے یورپین اسٹاف خصوصاً مسٹر براؤن اور مسٹر مارلیسن اور طلباء کالج کے تعلقات پر ایک گہرا مخالفانہ اثر پیدا ہو گیا اور نہ صرف اسٹاف اور طلباء کے درمیان بلکہ اسٹاف اور امنائے کالج کے تعلقات پر بھی ایک مستقل اثر کہ جس کا نتیجہ آئندہ چل کر اچھا نہ نکلا پڑا۔ جب آغا خان بحیثیت وزیٹر کالج میں آئے اور اُس میں نواب محسن الملک مرحوم نے ایسی تقریر کی کہ جس کا ایک جزو عربی اسکیم کے خلاف پہلو لئے ہوئے تھا۔ اِس پر مسٹر مارلیسن

میری نگاہوں کے سامنے صاحب موصوف پر اس قدر بگڑے اور سرخ ہوئے
کہ جو صفات کروڑ مسلمانوں کے رہبر کی شان اور عزت کے بالکل خلاف تھا۔
بدقسمتی سے اس کے کچھ ہی روز بعد ایک نیا مضمون یونین میں درباب خلافت پیش
ہوا اور نیز جس کے مؤید مسٹر مارلین تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ خلافت موجودہ
اسلام میں کوئی چیز نہیں ہے اور مسلمانان ہند سلطنت برطانیہ کی رعایا ہو کر کسی
دیگر سلطنت کے فرمانروا کو خلیفہ نہیں مان سکتے اس پر ایک گرم مباحثہ ہوا
جس میں محسن علی کلکتوی کا جواب مضمون اس مباحثہ کی یادگار رہے گا
اور یہ بھی مضمون یونین میں پاس نہ ہونے پایا تعلقات باہمی پر یہ سم قاتل کا
اثر کر گیا۔ اب کیا تھا طلبا تو طلبا، ٹرسٹیوں سے جھگڑے شروع ہو گئے اور
کالج کے طلبا کی اس خودداری اور آزادانہ روش کو مٹانے کے لئے ریشہ
دوانیاں شروع ہوئیں۔ اور کالج جنگ جدال کا اکھاڑا بن گیا۔ ایک زمانہ
کے بعد پھر یونین میں ایک مضمون عبدالرحمن بجنوری نے پیش کیا جو مسلمانوں
کی پستی کے متعلق تھا اور جس کے الفاظ یہ تھے۔ ؎

اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے — پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے — مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد

دوران مباحثہ ہی میں اس پر جھگڑا شروع ہوا اور آخر کار اس پر مباحثہ کیا
جانا بند کر دیا گیا اور اب کالج جنگ و جدال کا اکھاڑا بن گیا طلباء کی روک
تھام کے لئے نئے نئے قانون بننے لگے سوسائٹیوں کے قانون محدود کئے
گئے انڈین اسٹاف کے حقوق نظر انداز ہونے لگے اُن طلبا پر کہ جو خود مختارانہ
رائے کا اظہار کرتے تھے سختی شروع ہوئی امتناعی نامہ کالج سے بات بات
میں الجھنے لگے مسٹر مارلین کے جانے کے بعد مسٹر کارنایل پرنسپل ہوئے

آدمی برانڈ تھا مگر بے لگام تھا۔ ایکروز درجے میں آپ فرمانے لگے کہ باورچی خانے کے قریب جو چبوترہ ہے وہ میں اکھڑوا کر پھنکوا دونگا۔ یہاں ایک آدمی صبح ہی صبح پہنچتا ہے اور میرے سونے میں خلل ڈالتا ہے جب کسی نے بتلایا کہ وہ نوکروں کی مسجد ہے تو فرمانے لگے کہ مجھے اِس کی کچھ پرواہ نہیں درجے اور رواداری اقامے کی زندگی میں پروفیسر کھلم کھلا اِس کا اظہار کرنے لگے کہ وہ ہندوستانیوں کو ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ اور اراکین کالج کی ایک شمہ بھر بھی وقعت اُن کی نگاہوں میں نہیں ہے پروفیسروں نے طلبا کو اپنے یہاں بلانا اخلاق سے بات کرنا اور اُن سے ملنا ترک کیا اور نہ صرف یہ کیا بلکہ اگر کوئی اُن کے پاس جاتا تو وہ گھنٹوں دروازے پر انتظار کرنا اور جب پروفیسر صاحب اُس کو شرف باریابی کا اعزاز بخشتے تو اُس کو کرسی پر بٹھانا ایک امر حرام سمجھتے چنانچہ مسٹر ٹول کی پرنسپلی کے زمانے میں ایک انڈین اسٹاف کے ممبر مسٹر ٹول سے ملنے کیلئے گئے اطلاع کرانے پر وہ باہر ہی برآمدے میں بٹھائے گئے اِس سے پہلے ایک اور طالب علم ملاقات کیلئے باہر انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے مسٹر ٹول نے ایک تھوڑے عرصے کے بعد خود ہی چک اُٹھائی تو ممبر انڈین اسٹاف آگے کو بڑھے لیکن مسٹر ٹول نے فوراً ہی کہا کہ آپ پہلے نہیں بلکہ یہ طالب علم جو پہلے کا آیا ہوا ہے کوئی واقعہ اتنک ایسا نہیں ہوا کہ یورپین اسٹاف کے کسی انگریز ممبر کو مسٹر ٹول نے برآمدے میں کھڑا کیا ہو اور اُس سے پہلے اگر کوئی طالب علم آیا ہو تو اُس طالب علم کو اُس پر ترجیح دی ہو۔ ڈرل جو ایک مفید چیز تھی اور جو عام طور پر کالج میں پسندیدہ تھی) وہ رفتہ رفتہ کالج سے ندارد کی گئی، ایک کھیل کو ترجیح دیکر دوسرے کو نیچے گرا یا گیا بورڈنگ میں ڈیوائڈ اینڈ رول کی پالیسی شروع ہوئی۔ یونین سے یورپین

پروفیسروں نے قطعی طور پر دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ مضامین کے انتخاب میں سخت رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ اور کالج کے طلبا پر پولیٹیکل تحریک میں شریک ہونیکا الزام لگایا گیا درجے میں طالب علموں کو جو دل میں آیا وہ کہدیا خواہ وہ اُن کی قومیت کے خلاف ہو یا عزت کے خلاف ہو چنانچہ ایک پروفیسر صاحب کہ جو تاریخ پڑھانے کیلئے تشریف لائے تھے اُنھوں نے اپنی تاریخ دانی کا اس طرح ثبوت دیا کہ ایک روز فرمانے لگے کہ نور جہاں ایک بازاری عورت تھی جس پر کلاس ہی میں تو تو میں میں تک نوبت پہنچی مسٹر کارنا نے اپنے پرنسپلی کے زمانے میں ایک روز ایف۔ اے کی جماعت کو پڑھاتے وقت اپنی زبان فیض ترجمان سے یہ گوہر افشانی فرمائی کہ عبدالحمید (سلطان ٹرکی) پر اگر میرا بس چلے تو پھینکا قلمی بناؤں۔ ایسے ہی ایک ڈنر میں ایک انڈین اسٹاف کے ممبر کو ایک انگریز پروفیسر نے نہایت نامہذب طریقے سے اُس کرسی سے ہٹا دیا کہ جس پر اگرچہ کوئی نام نہیں لکھا ہوا تھا لیکن اُنھوں نے اپنے خیال میں ایک اور انگریز پروفیسر کیلئے مخصوص کر دی تھی اور جس برتاؤ کرنے کا اُس پروفیسر کو کسی طرح بھی حق نہ تھا ایسے ہی ایک قومی جلسے سے ایک اعلیٰ طالب علم کو کہ جس کا وہ ممبر تھا مسٹر آرچ بولڈ نے تنہا اپنی رائے سے نہایت سختی کیساتھ خارج کر دیا اور اور ہندوستانی ارکین مجلس نے افسوس ہے کہ اُسموقع پر زبان تک نہ ہلائی۔ از ماست کہ بر ماست۔ بد قسمتی سے مسٹر آرچ بولڈ کالج میں پرنسپلی کے عہدے پر مقرر ہوئے اور وہ اپنے ساتھ ایک لفظ ڈسپلن کا لائے۔ پروفیسر درجے میں طالب العلم کو احمق اور بدمعاش کہدے تو اُسکی شکایت کرنا یا اُس سے الجھنا ڈسپلن کے خلاف تھا۔ طلبا کالج کو انگریز پروفیسر اپنے بیان بنچ کی ملاقات میں کرسی نہ دے تو اُسکی شکایت کرنا ڈسپلن کے خلاف تھا۔ اہانتِ قومی پر کچھ زبان ہلا دینا اور یہ ظاہر کرنا کہ یہاں بھی مسلمانوں کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور اُن کے

دلوں میں بھی قومی اور مذہبی احساس ہے تو یہ ڈسپلن کے خلاف تھا۔ بلا قصور بلا وجہ صرف ایک پروفیسر کے واہمہ پر اگر لڑکا سزا پا جائے تو اس کا اپیل کرنا ڈسپلن کے خلاف تھا طلبا کالج کا ٹرسٹیوں اور خصوصاً آنریری سکرٹری سے ملنا اور اپنی ضروریات پر توجہ دلانا ڈسپلن کے خلاف تھا غرضکہ یہ ڈسپلن ایسی وبا اپنے ساتھ لائے کہ کوئی کام ڈسپلن کی ترازو میں پورا اترتا ہی نہ تھا ہاں اگر کوئی امر اس معیار پر اترتا تھا تو جب کہ اس میں کچھ ذلت ملی ہوئی ہو حاکم و محکوم کا فرق بین ہو اسلامی روح مفقود ہو چنانچہ انکی پرنسپلی کے زمانے میں واقعات پر واقعات ہونے لگے اور مواد پیدا ہوتے ہوتے یہ فروری ۱۹۰۷ء کا واقعہ پیش آیا کہ جس میں طلبا کالج کو ضبط کا یارا نہ رہا اور آخر کار کالج میں ایک شورش پیدا ہو گئی کہ جس کے واقعات حسب ذیل ہیں

واقعاتِ شورش

۸ فروری ۱۹۰۷ء میں بمقام نمایش ایک پولیس کانسٹبل اشیاء نمایش دیکھنے سے طلباء کالج کو بیجا طور پر مزاحم ہوا مگر سکرٹری نمایش نے اسے فہمایش کردی اور طلباء نے اسے کافی سمجھ کر خاموشی اختیار کی۔

۹ فروری ۱۹۰۷ء اسی کانسٹبل نے پھر طلباء کو روکا لیکن چونکہ وہ ہمیشہ نمایش اشیاء اسی مقام سے دیکھا کرتے تھے جہاں سے معززین شہر دیکھا کرتے تھے وہ اندر چلے گئے کانسٹبل نے اپنے منہ کی ایک پھنسی میں خراش کر لیا اور اپنے انسپکٹر سے رپورٹ کی کہ طلباء نے مجھے مارا ہے۔ انسپکٹر نے آکر دریافت کیا طلباء نے اس سے انکار کیا اس نے غلام حسین کو تبلایا کہ انھوں نے مجھے مارا ہے کیونکہ اندر جانے کے بارے میں ان ہی سے گفتگو ہوئی تھی:۔

۱۰۔ فروری ۱۹۰۷ء۔ پرنسپل صاحب نے غلام حسین کو طلب کیا۔ اور فرمایا کہ
حکام نے تمہارے خلاف رپورٹ کی ہے اور کہا کہ یہ اہم معاملہ ہے۔ ممکن ہے
کہ کچھ مہینے کی قید ہو جائے اِس لئے میں تمہیں تین مہینے کیلئے کالج سے اسٹیکٹ
کرتا ہوں (یہ پہلا حکم ہے جو غلام حسین کو دیا گیا) غلام حسین نے عرض کیا
کہ میں بے قصور ہوں اور میری یہ درخواست ہے کہ آپ قبل اس کے کہ مجھے سزا
دیں معاملے کی تحقیقات فرماویں۔ مگر پھر پرنسپل صاحب نے اِس پر کچھ توجہ نہ کی اور
فرمایا کہ اگر تم اسے منظور نہیں کرتے تو میں تمہیں عدالت کے سپرد کردوں گا مگر۔
غلام حسین اور دیگر طلباء موجودہ نمائش نے اپنے حلفی بیانات لکھکر اُن کی
خدمت میں بھیج دیئے۔

۱۱ فروری ۱۹۰۷ء چونکہ غلام حسین کی بے قصوری مسلم تھی اِس لئے تمام
طلباء دو بجے میدان میں کرکیٹ کے یہ مشورہ کرنے کیلئے جمع ہوئے کہ پرنسپل
صاحب کو معاملہ کی پوری تحقیقات پر توجہ دلائی جائے۔ اسی اثناء میں براؤن
صاحب آ گئے۔ انہوں نے کل حالات سن کر یہ وعدہ کیا کہ وہ پرنسپل صاحب سے
طلباء کی طرف سے گفتگو کریں گے شام کو طلباء براؤن صاحب کے پاس گئے کہ وہ
حسب وعدہ پرنسپل صاحب کے پاس جائیں مگر انہوں نے لیت ولعل میں ٹال دیا
اتفاقاً وہاں سے پلٹتے ہوئے خود پرنسپل صاحب مل گئے اور طلبائنے ہر طرح بہ منت
الحاح عرض کیا کہ وہ اپنے حکم پر دوبارہ غور کریں اور کافی تحقیقات فرمائیں
مگر پرنسپل صاحب نے نہ مانا پرنسپل صاحب کا بڑا عذر یہ تھا کہ اگر غلام حسین بیگناہ
ہے تو وہ اپنے کو عدالت میں بے گناہ ثابت کرے ایسی حالت میں میں کوئی
سزا اسے نہ دوں گا اور حکام ضلع نے صرف دو ہی صورتیں پیش کی ہیں کہ
میں سزا دوں یا غلام حسین پر مقدمہ چلایا جائے غالباً انہوں نے یہ خیال

کیا ہوگا کہ طلبا یہ زحمت اپنے سر نہ لیں گے۔ کیونکہ طلبا نے اُن سے یہ عرض کر دیا تھا کہ عدالت میں نہ کبھی ہم گئے اور نہ اب جانا پسند کرینگے۔ لیکن جب انصاف ہوتے نہ دیکھا تو بدرجہ مجبوری طلبا نے رات کو ایک جلسہ کیا اور اقرار کیا کہ مقدمہ چلایا جائے اور بہترین قانونی مشورت حاصل کیجائے اور اس کے لئے جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو طلبہ یکجا کریں۔

۱۲ فروری ۱۹۰۷ء پرنسپل صاحب کو طلبہ کے اِس ارادہ کی جب اطلاع ہوئی تو انھوں نے غلام حسین کو اپنے دفتر میں بلایا اور کہا کہ تم سپرنٹنڈنٹ پولیس کے نام معافی کا ایک خط لکھو۔ غلام حسین نے ہرچند عذر کیا کہ وہ بیگناہ ہے اور اس طرح کے خط لکھنے کے بعد اس کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے گی (کیونکہ طلبہ کا ارادہ معاملے کی عدالت میں جواب دہی کرنے کا تھا) مگر پرنسپل صاحب کے اصرار سے مجبور ہو کر انھیں خط لکھنا پڑا خط لکھانے کے بعد ہی پرنسپل صاحب نے غلام حسین پر بیس روپیہ جرمانہ کیا اور کہا کہ تم بورڈنگ میں اپنی موجودگی کی اطلاع دیا کرو (یہ دوسری سزا ہے) لڑکوں کو جب معلوم ہوا تو ان پر بہت شاق گذرا مگر بلحاظ ادب پرنسپل صاحب کے وہ خاموش ہو گئے اور یہ قرار دیا کہ جرمانے کی رقم تمام طلبا کالج پر پھیلائی جائے تاکہ سب اِس میں شریک ہوں کیونکہ غلام حسین بالکل بے قصور ہے شام کو ایک جلسہ کیا گیا جس میں اسکول کے وہ طالب علم پیش ہوئے جن میں پولیس نے گھوڑ دوڑ کے مقام پر مارا تھا اور ولیعہد بہادر مرشدآباد اور مرزا نذیر بیگ صاحب (برادر زادۂ نواب محسن الملک بہادر مرحوم) نے جو حیدرآباد کے معزز عہدہ دار ہیں اور اس وقت علی گڈھ میں آئے ہوئے تھے اِس کی چشم دید شہادت دی۔ یہ قرار پایا کہ پرنسپل صاحب سے درخواست کی جائے کہ اِن طلبا کے معاملے پر افسران پولیس کو

متوجہ کریں۔ شب کو طلباء کا جلسہ پھر گریجویٹ لائن پر ہوا۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد
صاحب نے طلباء اسکول کے معاملے میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا (مگر کچھ
دادرسی نہ ہوئی)۔

۱۲ فروری ۱۹۲۱ء ۹ بجے صبح پرنسپل صاحب نے اسٹریچی ہال میں جلسہ کیا
اور فرمایا کہ مجھے اب جاکر ہندوستان کے پولیس کا حال معلوم ہوا ہے مگر جو کچھ
ہوا اس کو رفت گذشت کرو۔ میں بھی بھول جاؤں گا تم بھی اسے بھول جاؤ
میں نے غلام حسین پر بیس روپیہ جرمانہ کیا ہے اور غلام حسین معافی کا خط
بھی لکھ چکے ہیں اب اس معاملے کی نسبت کچھ نہ کہو ہاں اسکول کے بچوں
کیلئے میں اپنے مقدور بھر کوشش کروں گا (مگر کچھ نہ ہوا) لڑکوں نے اُن کے
حکم پر سر تسلیم خم کیا اور اپنے اپنے کمروں پر چلے گئے۔ اور گونہ اطمینان ہوا
شام کو غلام حسین کے نام پرنسپل صاحب کا حکم آیا کہ تم جب تک یہاں
رہو بورڈنگ سے باہر نہ جاؤ (یہ تیسرا حکم ہے) اس سے ایک گونہ اضطراب
پھر پیدا ہوا مگر۔

۱۴ فروری ۱۹۲۱ء کو غلام حسین پرنسپل صاحب کے پاس گئے۔ اور
دریافت کیا کہ یہ سختی میں کب تک برداشت کر سکتا ہوں۔ پرنسپل صاحب نے
فرمایا کہ میں تم کو مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ تم اپنے سب پراکٹر سے پوچھ کر باہر جا سکتے
ہو اسی روز رات کو طلباء نے یہ غور کرنے کیلئے ایک جلسہ کیا کہ اکثر دقتوں کا
سبب مسٹر براؤن ہوتے ہیں پس کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں کہ طلبہ
کی طرف سے جو بدگمانیاں مسٹر براؤن کو ہیں وہ باحسن وجوہ رفع ہو جائیں
اور اُن کا دل ہماری جانب سے صاف ہو جائے۔ چنانچہ ایک تجویز یہ
بھی تھی کہ سب طالب علم مل کر ڈنر کریں جس میں اسٹاف بھی مدعو ہو اور

تصویر بھی اُس موقع پر لیجاتے۔ طالب علموں کو اس سے اپنے حصول مطلب کی بہت کچھ امید تھی۔

۱۵- فروری ۱۹۰۷ء۔ غلام حسین آج شام کو اپنے سب پراکٹر کے ہمراہ سوسائیٹی گارڈن میں (کہ وہ بھی کالج کا بورڈنگ ہے) گئے۔ پرنسپل صاحب نے انہیں وہاں دیکھا اور آکر براؤن صاحب کے ذریعہ یہ حکم دیا کہ غلام حسین فوراً کالج چھوڑ دے اور علیگڈھ سے چلا جائے (یہ چوتھا حکم ہے جو غلام حسین کو دیا گیا) اس کے ساتھ ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ براؤن صاحب سب پراکٹروں پر یہ زور دے رہے ہیں کہ سرگردہ طلباء کے نام بتائیں تاکہ انہیں بھی سزا دی جائے اس پر طلبا میں سخت برہمی پھیلی پرسوں جب معاملہ یکسو کر دیا گیا تو پھر پرنسپل صاحب نے غلام حسین کو نئی سزا کیوں دی اور براؤن صاحب طلبا کے لیڈروں کے نام کیوں دریافت کرتے ہیں اس کے قبل بھی براؤن صاحب تھرڈ ایر کلاس میں کہ چکے تھے کہ تم میں سے چند کو بالآخر ضرور اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے اسی دن یہ بھی معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا ہے کہ چونکہ اسکول کے لڑکوں کے جسم پر کوئی نشان نہیں ہے لہذا اس میں کچھ نہیں ہو سکتا لیں ایک جلسہ رات کو یونین کے میدان میں (یعنی گریجویٹ لان پر) جمع ہوا کہ پرنسپل صاحب کو اُن کا وعدہ یاد دلایا جائے اور یہ کہ براؤن صاحب اب کس جرم میں ہمیں سزا دینا چاہتے ہیں، اور نیز یہ کہ غلام حسین کو جو حکم دیا گیا ہے اُس کی علت کیا ہے (کیونکہ غلام حسین نے نہ صرف اپنے سب پراکٹر کی اجازت سے بلکہ اُن کے ہمراہ سوسائیٹی گئے تھی) اور اسکول کا ناکردہ گناہ بچوں کی بھی دادرسی ہوئی! لڑکوں کے دلوں میں اگرچہ جوش بھرا ہوا تھا مگر جلسہ کی کارروائی

متانت کے ساتھ ہو رہی تھی کہ مسٹر براؤن ۔ میر ولایت حسین اور دو سب پراکٹر
وہاں آگئے (پراکٹر اور سب پراکٹر صاحبان نے اُس وقت براؤن صاحب کو
لڑکوں کے مجمع میں جانے سے بہت روکا لیکن براؤن صاحب کسی ماتحت
کی صلاح پر کاربند ہونے کو ذلت سمجھتے تھے اِس لئے اُدبدا کر وہ وہاں آ
اور گو کہ جانتے تھے کہ اُن کی بدسلوکیوں کا اثر لوگوں پر بہت بُرا پڑا تھا
کچھ پرواہ نہ کی) لڑکوں نے اُن سے باادب درخواست کی کہ ہمارا یہ جلسہ
بالکل پرائیوٹ ہے آپ یہاں تشریف نہ لایئے۔ براؤن صاحب نے بہت
بگڑ کر کہا کہ دو منٹ کے اندر منتشر ہو جاؤ مگر اتنے بڑے مجمع پر ایک دم قابو
حاصل کرنا مشکل تھا۔ جو سنجیدہ طلبہ تھے وہ اوروں کو سمجھا رہے تھے وقت
گذر گیا اور براؤن صاحب نے پھر ڈانٹا۔ اور آخر میں کہا کہ بدمعاشو! ادو فیر
میں منتشر ہو جاؤ گے وہ تو یہ کہکر چلے گئے (۱) مگر یہ الفاظ گویا الٹی میٹم تھی
کہ اب اُن میں اور طلبا میں کوئی تعلق باقی نہ رہا ہم جو کل سے نیک نیتی
کیساتھ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح براؤن صاحب ہم سے صاف
ہو جائیں اُس سے ہمیں کلیتاً ناامیدی ہو گئی اور ہم اپنے قابو میں نہ رہے
اِس عالم بیخودی میں پرنسپل صاحب ہم میں آئے اور ہم نے اُن سے
دریافت کیا کہ آخر یہ ظلم ہم پر کیوں کئے جاتے ہیں پرنسپل صاحب نے
غیر شفقت آمیز گفتگو کر کے اور بھی ہمارے دل کو توڑ دیا طلبا نے اُن سے
صاف کہدیا کہ اس ظلم و ستم کے اصلی باعث براؤن صاحب ہیں ورنہ
ٹول صاحب اور بک صاحب کی ہم دل سے عزت کرتے ہیں ٹول صاحب
ایک مدت سے یہاں ہیں لیکن ہم اُن سے اب تک ہرگز شاکی نہیں ہم کوئی
دیوانے نہیں کہ ہر شخص کی شکایت کریں حسرت و یاس کے ساتھ ہم لوگ

سید کی قبر پر گئے اور وہاں فاتحہ پڑھی۔ اور بہت دیر تک روتے رہے اور باہم عہد کیا کہ جب تک پرنسپل صاحب ہم سے بزرگانہ اور مشفقانہ برتاؤ نہ کریں گے ہم کلاس نہ جائیں گے۔

۱۶ر فروری ۱۹۰۷ء پرنسپل صاحب کو جب ہمارا ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے بطور خود ۱۶ر فروری کو کالج بند کر دیا (اس کے بعد ۲ر مارچ تک تعطیل تھی) صبح کو معلوم ہوا کہ ہمارے اس معاملے پر پولٹیکل رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی اور اس لئے پرنسپل صاحب اور پروودسٹ صاحب کے بنگلوں پر کالج کے قرب وجوار میں مسلح پولیس کے پہرے مقرر کر دیئے گئے تھے اس خبر سے طلبہ کو سخت رنج ہوا اور فوراً طلباء کا جلسہ ہوا اور اس امر کی تردید کی گئی کہ کسی خارجی پولٹیکل اثر کے سبب ہم یہ کارروائی کرتے ہیں (کیونکہ پرنسپل صاحب کی شب کی تقریر سے ایسے مضامین مترشح تھے) ہم نے نواب ممتاز الدولہ بہادر اور نواب محسن الملک بہادر سے ملنے کی خواہش کی اول الذکر نواب صاحب نے فرمایا کہ نواب محسن الملک بہادر جو کہیں وہ کرو اور خود نواب محسن الملک بہادر نے ملنے سے انکار کر دیا رات کو بیک منزل میں طلباء نے پھر جلسہ کیا اور پروفیسر ٹول اس کے صدر ہوئے اور طلباء نے یہ رائے پاس کی کہ ہرگز ہم سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جو قانون یا کالج کے ڈسپلن کے خلاف ہو اور باہم ہمدردی کا عہد دوبارہ تازہ کیا ٹول صاحب نے فرمایا کہ میں تم سے ہمدردی رکھتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ یہ ناگوار واقعات پیش آئے میری نصیحت یہ ہے کہ جو کچھ کرو بہت سمجھ بوجھ کر کرو کہ ہڑتال ہمیشہ حق بجانب ہوا کرتی ہے لیکن اُن کے نتائج بُرے ہوا کرتے ہیں لہٰذا اپنے نفع نقصان کو سوچ لو۔

۱۷ فروری ۱۹۰۷ء طلباء نے چند ٹرسٹیوں سے جو کالج میں تشریف لائے اپنا حال بیان کیا انھوں نے گو چاہتے کہ طلباء کا ہمدرد بنا یا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ خیال کسی طرح پیدا کر دیا گیا کہ اس معاملہ میں کالج کے منتظمین ایک طرف اور طلباء دوسری طرف ہیں چنانچہ اُن کے جتنے فیصلے ہوئے سب اسی بنا پر تھے۔ حالانکہ ہماری کارروائیوں کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ ہم منتظمین کالج سے کچھ مخالفت پیدا کریں بلکہ ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ ہمارے ساتھ مہربانی اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے اور اس کے پورا کرنے میں منتظمین کی کسی طرح یہ بھی سبکی نہ تھی مگر بعض وقت انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔

زرشک مدعی داد م قرار ووداری از قریب بہ فریب بخت بد رانام غیرت کردم و رفتم

اسی روز ٹرسٹیوں کی میٹنگ میں قرار پایا کہ

(۱) غلام حسین کو پرنسپل صاحب کے حکم کی تعمیل کرنا چاہئے:۔

(۲) طلباء کو چاہئے کہ ۱۸ فروری کے ۸ بجے تک معافی نامہ داخل کریں۔

یہ حکم ہمیں اسٹریچی ہال میں سنایا گیا جو ہم نے باادب سنا ہم ششدر تھے کہ معافی نامہ کس بات کا داخل کریں اور اُس میں کیا لکھیں اور ہم نے بالآخر یہ طے کیا کہ یا تو غلام حسین ہی کالج میں رہیں یا ہم سب کالج کو چھوڑ دیں کیونکہ غلام حسین کو جو سزا ہوئی وہ ہرگز اُس کے مستحق نہیں تھے اور کوئی تحقیقات جانبین کی نہیں کی گئی بلکہ فیصلہ یکطرفہ کیا گیا۔

۱۸ فروری ۱۹۰۷ء حکیم اجمل خاں صاحب اور چند دوسرے ٹرسٹیوں نے طلباء سے کہا کہ "تم اپنے ۱۵ قائم مقام منتخب کرو اور ہم لوگ اُن سے گفتگو کریں" طلباء نے یہ عذر کیا کہ اُن قائم مقاموں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس پر حکیم صاحب اور دیگر حضرات نے ذمہ لیا کہ ہرگز ان میں سے ایک کو بھی کسی

طور پر نقصان نہ پہنچے گا۔ چنانچہ پندرہ طلباء منتخب ہوئے۔ نواب محسن الملک بہادر نے بھی چند طلباء کو طلب کیا اور کہا کہ تم معافی نامہ داخل کرو اور یقین رکھو کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تمہارا ذمہ وار ہوں اگر تم میں سے ایک بھی نکالا جائے گا تو میں خود استعفاء دیدوں گا،، تعمیلاً للحکم طلباء نے نواب صاحب کو

۱۹ر فروری ۱۹۰۷ء کو اطلاع دی کہ ہم معافی نامہ داخل کرنے کے لئے طیار ہیں نواب صاحب نے اظہار خوشنودی فرمایا اور تین بجے کا وقت مقرر کیا اور خود پرنسپل صاحب کے پاس گئے۔ کہ اب چلئے اور طلبا کی معافی قبول کیجئے اور یہ بھی کہا کہ میں نے اور دوسرے ٹرسٹیوں نے طلباء کو یقین دلایا ہے کہ انھیں اب زاید نقصان نہ پہنچے گا۔

اس پر پرنسپل صاحب نے برافروختہ ہو کر کہا کہ آپ نے کس اختیار سے یہ کہا ہے کہ میں معافی قبول کروں گا نواب صاحب واپس چلے گئے اور طلبا کو پیغام بھیجا کہ تم لوگ اپنے اپنے کمروں کو جاؤ۔ یہ اختلاف ٹرسٹیوں اور پرنسپل کے درمیان ہوا خمیازہ اس کا طلبا کو بھگتنا پڑا۔ نواب صاحب کے حکم کے مطابق معافی نامہ پرنسپل صاحب کو بھیج دیا گیا۔ اور اُس کی رسید بھی آ گئی۔ تو

۲۰ر فروری ۱۹۰۷ء کو ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی معرفت پرنسپل صاحب کا حکم آیا کہ اور سات طلباء کو وہ کالج سے خارج کرتے ہیں (اول سات میں چار منجملہ اُن پندرہ طلبا کے تھے جو قائمقام تجویز کئے گئے تھے) یعنے اول۔ غلام حسین (۲) عبد الرحمٰن بجنوری (۳) تصدق احمد شروانی (۴) قاضی عبد العزیز

(۵) گورکھ ناتھ (۶) محمد حسین انبالوی (۷) سید محمود۔

یہ حکم سنکر طلبا نواب صاحب کے پاس گئے۔ کہ آپ نے ہمارا ذمہ لیا ہے مگر نواب صاحب نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ رات کو طلبا کی میٹنگ ہوئی اور ڈاکٹر

طلبا اس غرض سے باہر بھیجے گئے کہ اُن ٹرسٹیوں کو اپنے حالات سے آگاہ کریں جن کو اب تک خبر نہوئی تھی اور اُن سے استدعا کریں۔ چنانچہ اکثر ٹرسٹیان نے وعدہ کیا اور کالج میں آئے مگر سوائے نواب وقار الملک بہادر کے کسی نے وہ ہمدردی اور شفقت جو چاہئے تھی نہ کی۔

۲۱ر فروری ۱۹۰۷ء۔ طلبا نے عرضداشت نواب صاحب بہادر اور ٹرسٹیوں کی خدمت میں بھیجی کہ چونکہ آپ اپنے وعدے کے مطابق ہم کو محفوظ نہ رکھ سکے اس لئے ہم آپ سے رخصت چاہتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب نکال دیا جاویگا۔ ایسی غیر مطمئن حالت میں یہی بہتر ہے کہ ہم لوگ خود چلے جائیں اس عرضداشت پر منجملہ ۲۴۴ طلبا موجودہ بورڈنگ کے ۱۷۰ نے دستخط کئے تھے۔

۲۲ر فروری ۱۹۰۷ء طلبا نے اپنا اسباب درست کیا اور رخت سفر باندھا ردی اسباب کو (جو اُن کی ملکیت تھا) یکجا کر کے جلا دیا کچھ طلبا جا چکے تھے اور کچھ جا رہے تھے اور کچھ دوسرے دن جانے کا قصد رکھتے تھے ٹرسٹیوں نے اپنی آج کی میٹنگ میں یہ طے کیا کہ اگر ضرورت پڑے کالج ایک ماہ کے لئے بند کر دیا جائے۔

۲۳ر فروری ۱۹۰۷ء تین بجے دن کی میٹنگ میں ٹرسٹیوں نے ایک کمیشن تحقیقات حالات کیلئے مقرر کی جس نے کانسٹیٹیوشن کا حال معلوم کر کے اور کچھی بالیسی ہوئی اور سب نے قصد مصمم کالج چھوڑنے کا کر لیا مغرب کی نماز تمام طلبا نے مسجد میں ادا کی اور کالج کے لئے دعا کی سر سید کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور اپنے اپنے مکانوں کو رخصت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

ہم میں کچھ طلبا چند ضرورتوں کے سبب ایک دن کیلئے ٹھہر گئے تھے اور ایک بڑی ضرورت یہ تھی کہ ہماری کارروائیوں کی نسبت جو غلط خیالات

پھیلے ہوئے تھے اُن کی تردید کی جاتی چنانچہ ہم نے
۲۴-فروری ۱۹۰۷ء کو ایک تار ہز آنر لفٹنٹ گورنر کے حضور میں روانہ
کیا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے "ہم تمام طلباء ہز آنر کو مطلع کرنا چاہتے ہیں
کہ آج کل جو کالج کی کیفیت ہے وہ مطلق کوئی پولیٹکل حیثیت نہیں رکھتی صرف
چند ممبران اسٹاف سے جو شکایات ہیں اُن کے رفع کرنے کی کوشش ہے
ہم ہز آنر کو بادب یقین دلاتے ہیں کہ ہماری کوشش احاطہ کالج کے اندر
محدود ہیں اور تہذیب اور واجبیت کے منافی نہیں ہیں۔ ہم خیر خواہ سرکار طلباء
مدرستہ العلوم مسلمانان اپنے محترم ہادی سر سید احمد خاں کی پالیسی پر ثابت قدم ہیں
اور اُس بن مانگی مدد لینے سے جو باہر کے لوگ دینے کو تیار تھے ہم نے انکار کردیا
اگر مدد لینی ہوتی تو ہم ہز آنر سے بحیثیت سرپرست کالج کی مدد مانگنی زیادہ
پسند کرتے۔

اس زمانۂ تعطیل میں امنائے کالج نے طلباء اور اُن کے والدین کے
پاس بذریعہ سکریٹری گشتی چٹھیاں روانہ کیں اور بلا کسی شرط کے کالج میں
واپس آنے کیلئے زور دیا۔ مگر ان تحریرات کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور اُن میں سے
اکثر مختلف کالجوں میں داخل ہوگئے آخر کار ۲۴ مارچ ۱۹۰۷ء کو ایک کمیشن
بیٹھا اُس میں چند پرانے طلباء اور دیگر اصحاب بیرونی کہ جن کو کالج سے
تعلق تھا اور چند موجودہ طلباء کالج کی شہادتیں ہوئیں اور بعد تحقیقات کے
یہ فیصلہ ہوا کہ کالج سے کسی طالب علم کو نہ نکالا جائے۔ غلام حسین کو اجازت
دی جائے کہ وہ بی۔ اے کے امتحان میں کالج میں رہکر شریک ہو۔ لیکن
اُس کے بعد کالج میں آئندہ تعلیم کے لئے داخل نہ کیا جائے اس فیصلے سے
طلباء راضی ہوگئے اور سب کالج واپس ہوئے۔

دور جدید

انقلاب ۱۹۰۶ء کے بعد میں پھر کالج پہنچا۔ اس زمانہ میں ساحر بنگالہ کہ جن کا تبادلہ بوجہ دو مرتبہ ناکامیاب ہو جانے کے بموجب قانون درسگاہ سحر آموز سے سرکاری جادو گھر واقعہ کنارہ دریائے جمن الہ آباد میں ہو گیا تھا پھر طلسم ہوش ربا میں کامیاب ہو کر واپس ہوئے اور اُن کی تعیناتی قلعۂ محمودیہ میں ہوئی اُس زمانے میں کالج کی زندگی نئے اصولوں پر کچھ خوشگوار تھی اور ڈیوایڈ اور رول کی پالسی نے روایات کالج اور آزادانہ روی کو مٹا دیا تھا۔ اِس ضمن میں یہ امر بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ ہماری اِس بربادی میں انڈین اسٹاف کا کچھ کم حصہ نہ تھا۔ ممبران یورپین اسٹاف تو غریب دوسری قوم وملت کے افراد ہیں اُن کو ہمارے ساتھ اگر ہمدردی نہ ہو تو کچھ تعجب نہیں مگر حیرت تو اِس پر ہے کہ ممبران انڈین اسٹاف کے برتاؤ کی بھی ساحرانِ کالج میں عام طور پر شکایت رہتی ہے اور اُن کا رویہ قابلِ اعتراض تصور کیا جاتا ہے باوجود ایک قومیت ہونے مذہب وملت محسوسات وادراکات کے متحد ہونے کے بھی اِن میں پوئے دغا نام کو نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ خود اپنی جماعت میں ایک دوسرے سے جدال وقتال کرنے کے شایق رہتے ہیں۔ مجھے یہ ریمارک کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ بجز چند ممبران انڈین اسٹاف کے اُن میں سے اکثر خودداری اور اتحاد کے معنی تک نہیں سمجھتے اور وہ اِس طرح اپنے ہاتھوں یورپین اسٹاف کے سامنے ہمیشہ ذلیل ورسوا

رہتے ہیں چاہئے تو یہ تھا کہ پروفیسران کالج مسلمان نسلوں کے افراد کے علمی اور اخلاقی حالت میں رہنما ہوتے۔ مگر یہاں برخلاف اس کے "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کے خود مصداق بن رہے ہیں ایسا ہونیکے چند وجوہ ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ انتخاب کے اچھے اصول کا مفقود ہوتا ہے اور اس لئے اکثر انتخاب ناموزوں ہوتا ہے ایک زمانہ وہ تھا کہ سرسید کی یہ آرزو تھی کہ وہ طلبار کالج کو اعلیٰ پروفیسروں کے عہدے پر دیکھے اور آئندہ دوسری قوموں کے افراد کا دست نگر ہونا نہ پڑے لیکن کالج کے انتخابی پالسی۔ پارٹی بندی کے اصول پر رہی ہے اور کوئی آزاد خیال قابل طالبعلم جو خود دار ہو اور اپنے حقوق کی اچھی طرح حفاظت کرنا جانتا ہو ہرگز منتخب نہ کیا جائیگا اس لئے کالج کے اس دور کی زندگی ہر طریقے سے برباد نظر آتی تھی ۔ اور خاصکر اس لئے کہ شورش طلبا ۱۹۰۷ء کا اثر اراکین کالج اور اسٹاف کے درمیان ابھی باقی تھا چنانچہ ۱۹۰۹ء کے شروع میں نواب وقار الملک اور پرنسپل کے درمیان ایک طالب علم کے معمولی قصہ پر جھگڑا شروع ہو کر بات گورنمنٹ تک پہنچی واقعہ یہ تھا کہ ایک طالب علم عبید الرحمن آسامی ۱۹۰۷ء میں کالج میں داخل ہوا اور وہ فرسٹ ایر کے امتحان میں صرف فارسی کے مضمون میں ایک نمبر سے ناکامیاب رہا ۔ مولوی خلیل احمد پروفیسر فارسی نے اس کو ترقی دینے کی سفارش کی چونکہ مسلمانان مشرقی بنگال کی تعلیمی حالت اس وقت اچھی نہ تھی اور یہ طالب علم تعلیمی کانفرنس کی تجویز کے بموجب کالج بغرض تعلیم بد وظیفہ آیا تھا اس لئے آنریری سکرٹری نے مسلمانان مشرقی بنگال کی تعلیمی نکبت کا تذکرہ کرتے ہوئے پرنسپل کو اس امر پر توجہ دلائی کہ مشرقی بنگال کے لڑکوں کے ساتھ اس سختی کے ساتھ

پیش آنے سے اُن کا کالج آنا بند ہو جائے گا۔ اور کانفرنس کی تجویزات بالکل بیکار ہو جائیں گی۔ لیکن پرنسپل صاحب نے اُس کو ترقی دینے سے انکار کیا۔ وہ طالب علم کالج چھوڑ کر مکان چلا گیا لیکن ۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اُس نے آنریری سکرٹری کو ایک خط لکھا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"جناب والا" میں گذشتہ سال آپ کے کالج میں فرسٹ ایر میں پڑھتا رہا ہوں میں بہت افسوس سے جناب کو اطلاع دیتا ہوں کہ اپنے والدین کی مالی حالت خراب ہونیکی وجہ سے مجھے تعلیم کو قطعاً خیرباد کہہ دینا پڑا۔ اور بمجبوری تلاش ملازمت کی ضرورت واقع ہوئی۔ میں آپ سے باادب درخواست کرتا ہوں بلکہ ملتجی ہوں کہ مجھکو ایک سرٹیفکیٹ بابت شرافت خاندانی اور عمدہ چال چلن کے مرحمت فرماویں جو بلاشبہ کسی ملازمت کے حاصل کرنے کیلئے میرے لئے ایک نہایت سودمند ہوگا:۔

آنریری سکرٹری نے اِس خط کو پرنسپل کی رائے دریافت کرنے کیلئے صاحب موصوف کے پاس بھیجدیا ۱۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اُن کا مفصلہ ذیل جواب آیا "مائی ڈیر نواب صاحب، عبیدالرحمن ایک اچھا طالب سرٹیفکیٹ کی درخواست مجھ سے نہیں کرتا ہے بلکہ آپ سے کرتا ہے۔ میں اِس امر کے کہنے پر خوش ہوں کہ آپ اُس کو ایک سرٹیفکیٹ دے سکتے ہیں۔ اور مسٹر ٹول کہ جنہوں نے اُس کا کام دیکھا ہے مجھ سے متفق ہیں،،

اِس کا جواب لکھتے وقت نواب صاحب نے پرنسپل صاحب کو ضمناً اِس کا بھی اشارا کر دیا کہ یہ وہی لڑکا ہے کہ جس کے متعلق مجھے جس طرح سے کہ اُس کا معاملہ طے کیا گیا ہے اُس کا افسوس رہے گا اِس خط وکتابت کی بنا پر نواب صاحب اور پرنسپل میں ایک طویل سلسلہ قایم ہو گیا۔ اور انگریزی

اسٹاف کالج نے بلا وجہ نواب صاحب سے ایک لڑائی مول لی ۔ چنانچہ
۲۰ ۔ مارچ ۱۹۰۹ء کو بدیں الفاظ پرنسپل نے استعفا پیش کیا :
"مائی ڈیر نواب صاحب ،، میں آپ کی تمام گذشتہ تحریرات پر اور پرنسپل کے اختیارات میں آئندہ مزید مداخلت کی پالیسی کے خیال پر کہ جو اب تک سختی کے ساتھ کی جا رہی ہے غور کر چکا ہوں ۔ تمام باتوں پر خیال کر کے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں .... چھٹیوں تک کالج کا ذمہ وار ہوں ۔ میں ہنر آنر نفٹننٹ گورنر کو اس مضمون پر آج رات کو لکھوں گا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے وہ اِس معاملے کو مجھ سے سنیں ۔ ......"

اِس کے بعد نواب صاحب اور ٹرسٹیان کالج نے مسٹر آرچ بولڈ سے استعفا واپس لینے کے لئے کوشش کی اور ہر طریقے سے اِس معاملے کے سلجھ کے طور پر فیصل ہو جانے کی سعی بلیغ کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور ۲۲ ۔ مارچ ۱۹۰۹ء کو ۲۱ ۔ مارچ ۱۹۰۹ء کا لکھا ہوا انگریز پروفیسروں کا متحدہ خط پہنچا ۔ جس کا مضمون مفصلہ ذیل ہے ۔

"ڈیر مسٹر آرچ بولڈ ۔ ہم نے نہایت افسوس سے سنا ہے کہ آپ نے پرنسپلی کے عہدے سے مستعفی ہونا ضروری سمجھا لیکن اِس ضرورت پر جس کی وجہ سے آپ کو یہ صورت اختیار کرنی پڑی ہے نہایت افسوس ظاہر کرتے ہوئے ہم اِس امر کے اظہار کرنے پر مجبور ہیں کہ آنریری سکرٹری کے پے در پے مداخلت سے یہ امر لازمی تھا ۔ کالج کی بہبودی کی وجہ سے ہم کو اب تک امید ہے کہ معاملہ اطمینان سے طے پا سکتا ہے جو کہ آئندہ کالج کے قابلِ اطمینان انتظام کے لئے مستقل گارنٹی ہو گا ورنہ ہم اس خیال کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ وقت آگیا ہے کہ مد نمبر ۱۳۹ ۔ اور ۱۴۱ قوانین

ٹرسٹیان پر عمل کیا جائے۔ دستخط۔ جے ایچ ٹول۔ جے سی ایس۔
جے ایم اشکرافٹ۔ بی ایچ گولڈی۔ جی گارلک۔ ایچ بی ڈسکلف۔
ایچ ٹو ورادون۔ جے ہارووز *

اِن تمام واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے ایک اجلاس بمقام لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس پر ۲۹۔ مارچ ۱۹۰۹ء بروز پیر کو منعقد کیا اور اِس میں آنریری سکرٹری اور پرنسپل کے اختلافات پر مباحثہ کرنا تجویز پایا حالانکہ نواب وقار الملک نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہز آنر کی مداخلت کا ابھی وقت نہیں آیا ہے

مسٹر آرچ بولڈ نے اپنے استعفے کی وجوہات جو دی تھیں اُن میں سے چار نمبر قابل ذکر ہیں
(۱) نواب مشتاق حسین طالب علموں کی شکایت کے سننے میں بطور عدالت اپیل کے ہوگئے ہیں
(۲) آنریری سکرٹری کالج کے داخلہ کے معاملہ میں مداخلت کرتے ہیں۔ اور کسی لڑکے کے کالج سے خارج کردینے کے فیصلے سے پہلے اس امر کا استحقاق جتانے میں کہ اُن کو تمام معاملات کی اطلاع دیجائے :۔
(۳) آنریری سکرٹری اسی طرح متنازعہ ترقی کے معاملہ میں مداخلت کرتے ہیں۔
(۴) نواب مشتاق حسین اس امر کا استحقاق جتلانے میں کہ پیشتر اسکے کہ کوئی طالبعلم ڈسپلن کیوجہ سے علیحدہ کیا جائے اُن سے مشورہ کرنا چاہیئے :۔

بعد مباحثہ لب یا ہز آنر اِس نتیجے پر پہنچے کہ تمام معاملات میں بعض دونوں جانب کی غلط فہمیوں سے پیدا ہوئی ہے اور یہ کہ بعض معاملات میں نواب صاحب بجا پہلو پر ہیں لیکن پرنسپل کے اختیارات میں آنریری سکرٹری کی بیجا مداخلت مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اِس مداخلت کا تذکرہ کرتے وقت یہ بھی فرمایا کہ علی گڈھ کالج کی ۱۹۰۷ء کی شورش کی وجہ سابق سکرٹری کا کالج کی پرنسپل کے اختیارات میں مداخلت دینا تھی شورش

طلبا سے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ پرنسپل کا اختیار بہت سختی کے ساتھ قائم رہنا چاہئے اور یہ بھی بیان کیا کہ پرنسپل اور آنریری سکرٹری کی ہندی پہلوانوں کی سی مثال ہے۔ کہ جو شروع شروع میں بغیر اس کی کوشش کے کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے شروع شروع میں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے ہیں اور اشارات کرتے اور منہ بناتے ہیں علاوہ ان شکایات کے اور معاملات کی بھی شکایت آنریری سکرٹری کی ہز آنر سے کی گئی اور ایک مزید مباحثے کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا۔ جس کی مزید تفصیل بیان غیر ضروری معلوم ہوتی ہے

اس کے بعد ۲۴-۲۸-۲۹- اپریل ۱۹۰۹ء کو ٹرسٹیوں کا ایک جلسہ اس معاملے کے متعلق ہوا جس میں ٹرسٹیوں نے نواب صاحب سے قریب قریب اکثر معاملات پر اتفاق کیا۔ اس کے علاوہ نیز دیگر ٹرسٹیاں اور بہی خواہاں کالج نے نواب صاحب کی اُن کارروائیوں سے جو کالج کی آزادی قایم رکھنے کے لئے وہ کر رہے تھے پورا پورا اتفاق کیا۔ ۹- اگست ۱۹۰۹ء کو لکھنؤ میں ہز آنر نے ٹرسٹیاں مدرسۃ العلوم کے سپاس نامہ کے جواب میں جو اِس موقع کے لئے لکھا گیا تھا اپنی شروع اسپیچ میں کالج کے مقاصد اور یورپین پروفیسروں کے فرائض کے متعلق تذکرہ کیا جس کا ترجمہ اس موقع پر دینا ضروری ہے۔ کہ جو اُن کی رہنمائی کیلئے نصب العین ہونا چاہئے:۔

"مہربانی کر کے ٹرسٹیوں کی عام جماعت کو جن کی طرف سے آپ آج یہاں آئے ہیں یقین دلائیے کہ مجھکو اس پر پورا اطمینان ہے کہ انہوں نے میری اس صلاح پر جو کہ میں نے آنریری سکرٹری اور پرنسپل کے اختلافات کے متعلق دی تھی کافی غور اور توجہ کیساتھ عمل کیا ہے۔

میں یہ سنکر خوش ہوں کہ اکثر امور پر وہ میرے خیالات کی ہمہ تن تائید کرتے ہیں۔ مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ ٹرسٹیوں کی خواہش کالج میں ڈسپلن قایم کرنے کیلئے ویسی ہی استوار ہے جیسی کہ مری۔ اور میں اُن اصولوں کیساتھ پوری ہمدردی رکھتا ہوں کہ جن کو آپنے گنایا ہے اور جنپر ڈسپلن کا قیام ہو سکتا ہے۔ یورپین پروفیسروں کو تمہارے ہی الفاظ میں طالب علموں کے دلوں میں نہ صرف خوف پیدا کرنا چاہیئے بلکہ وقار اور اعتماد اور جو محبت اور ہمدردی کے برتاؤ سے اور اُن کی خوشحالی اور بڑھنے والی آرزوؤں کی حقیقی تائید کو مدنظر رکھنے سے اُن میں پیدا ہو سکتی ہے میں خوشی سے آپ کی اِس راسے میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ اِس کالج کو صرف ایک تعلیمی درسگاہ خیال کرنا اور ایک سختی کیساتھ قوانین ڈسپلن کو اجرا دینے سے ہر معاملہ کی سٹریک ہو جانے کی امید کرنا علیگڈھ کی تحریک کے خلاف ہے۔ میں نیز اس امر پر متفق ہوں کہ ممبران اسٹاف کے فرایض کا ایک حصہ یہ بھی ہونا چاہیئے کہ وہ اِس تمثیل کو کہ کوئی پرنسپل یا پروفیسر کبھی اپنے فرائض کے کالج کی خدمات میں اچھی طرح ادا کرنے کی امید نہیں کر سکتا کہ جو ہندی مسلمانوں کے مقاصد سے اپنے آپ کو اچھی طرح مختص نہ کرلے پیش نظر رکھنی چاہیئے یعنے کہ اس کو قومی ترقی کا ایک آلہ سمجھے اور یہ کہ اِس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے کہ جو اِس تحریک کے پروگرام میں طے ہو چکی ہے عملی طور پر حصہ لے "

آخر کار یہ معاملہ بہزار دقت بسیار اچھی طرح پر بحسن وجوہ طے پا گیا اور اِس جھگڑے کا خاتمہ بخیر ہوا۔

سوسائٹی

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب میں نے بی۔ اے کی ڈگری لی تو بموجب قاعدہ احاطہ کالج چھوڑنا پڑا اور پھر سوسائٹی کے دارالاقامے میں مستقل کر دیا گیا لیکن صاحب بڑنگو جو بشانِ ناک کے معاملے میں ہمارے صدر تھے بوجہ اپنی ناکامیابی کے احاطۂ کالج میں ہی نظر بند رہے اور لطف صحبت کا مزا ایک گونہ کم ہو گیا۔ یہاں کا رنگ کچھ اور ہی تھا کالج کے اکثر قواعد وضوابط سے یہاں کے رہنے والے مستثنیٰ تھے اور اِس سلطنت کے اندرونی انتظام میں طلباء قانونی قریب قریب خود مختار تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے کے طلباء قانونی نے منتظمین کالج کو اپنی کسی بے عنوانی سے کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور اِس لئے پروفیسران اور منتظمین کالج نے اُن کو خود اُن کی اخلاقی حالت پر چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب سُنا گیا ہے کہ کالج کے قواعد وضوابط کا یہاں بھی اثر شروع ہو گیا ہے۔ یہاں کا نائب اتالیق خود طالب علموں میں سے منتخب کیا جاتا ہے :-

حافظ دیو

اِس زمانے میں حافظ دیو جو زمانۂ کالج میں قلعۂ محمودیہ میں رہتا تھا متعین تھا۔ یہ دیو بھی تختِ سلیمانی کے اراکین میں عمر عیار سے کچھ کم نہ تھا ہیئت کذائی یہ تھی کہ ہلکا گندمی رنگ۔ ناک چپٹی جس پر یہ گمان ہوتا تھا کہ گویا ساحری کے وار روکتے روکتے چپٹی ہو گئی۔ آنکھیں اندر کو اِس طرح غائب کہ جس طرح گلاؤں کی دیوار میں غلہ نظر آتا ہے

قدو مدن معمولی مگر رفتار اڑنگ بڑنگ طوطی کی ٹرٹنگ۔ دوسرے دور میں ایک اور ساحر نائب اتالیق ہوئے کہ جو اپنی سوسائٹی میں

ساحر ہپو | ہپو کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ اول اول جوان صاحب کو ملاحظہ کیا تو بات کرتے ڈر لگتا تھا۔ ایک گداز بدن کا اول جلول مجسمہ جس پر شبہ ہوتا تھا کہ کپڑے میں روئی بھر کر روح پھونک دی گئی ہے۔ منہ پھولا ہوا ایسا گویا کھڑ ہی کاٹ گئی ہیں بات کرو تو یہ معلوم ہوتا کہ ابھی کاٹ کھائیگا لیکن چپکے چپکے تحریری افسوں کی گولیاں آپ زمانے میں بہت چلاتے رہتے تھے۔

اس دور سے کچھ اور ساحر بھی قابل ذکر ہیں وہ کون ؟

مولانا | ان صاحب نے اسی سال ایل ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا تھا کالج میں بوجہ ڈاڑھی رکھنے کے مولانا کا خطاب ملا ڈگری لینے کے کچھ ہی دنوں بعد قانونی پروفیسر ہوئے۔ دیکھنے میں نہایت سیدھے دقیانوسی ملا معہ ایک اونچی ڈاڑھی کے وہ بھی نپولین کٹ معلوم ہوتے ہیں۔ نام کو تو مولنا کہلاتے ہیں۔ لیکن نئے تعلیم یافتوں میں جدید خیالات میں آپ کچھ کم بارود کی میگزین نہیں ہیں سوسائٹی میں اپنے زمانے کے لوجہ اچھکڑ تھے اور ساتھیوں کے پڑھانے میں تنبیہ الغافلین :۔

تار تخیل | یہ کالج کے پرانے ساحروں میں ہیں۔ لیکن چونکہ کالج میں فلسفہ سحر کا پڑھانے والا کوئی نہیں تھا تو آپ آگرے کے سرکاری جادو گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔ فلسفہ کی چاٹ کچھ ایسی لگی کہ آپ خود ہمہ تن فلسفہ ہو گئے اور اب آخری ڈگری کے لئے اس جادو گھر میں پھر واپس ہوئے پتلے دبلے ایسے جیسے کوئی بانس کی پتیاں نوچ کر پھینک دیتا ہے سنجیدہ اس قدر کہ آدمی رو کھا سمجھے۔ قومی ترقی کی تجویزات کی گٹھڑی مجسم خلاق کے پولندے۔ جادو تو از۔ پلنگ سوار فلسفے کی جان حسن اتفاق سے

دوبارہ جب آپ کالج میں تشریف لائے تو برائے چندے ایک قانونی طالب علم کے ساتھ آپ کو رکھا گیا۔ ایک چارپائی پر وہ اور دوسری پر آپ ایک دن دراز تھے سوتے سوتے جو دوست صاحب نے کروٹ لی تو آپ بہت ہی عجلت سے اٹھے اور اُن صاحب کی کروٹ دوسری طرف بدل کر کہنے لگے کہ ایک ہی سمت بے حس و حرکت پڑے رہیے۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا کہ حضرت یہ کیوں۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میرا تارِ تخیل تمہاری حرکت سے ٹوٹتا ہے:۔

ساحر احمد یہ ایک چھوٹی قسم کا ایک انچی سرخ ڈاڑھی والا ساحر ہے سوٹ پہنکر جب آپ چلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کرکٹ بیٹ کو کپڑے پہنا کر اُس میں جان ڈالی گئی ہے۔ اور جب آپ ہیٹ لگاتے ہیں تو امریکن پادری میں اور آپ میں کوئی تمیز نہیں ہوتی تعلیمی صیغہ میں آپ کو بڑا درک ہے اور اسکول قائم کرنے میں آپ کو یدِ طولےٰ حاصل ہے۔ آپ کو قادر کو لمبو کے نام سے بنی گالہ ہے یاد کیا جاتا ہے:۔

بیماری و بیمارداری ایک سال یہاں زندگی گذارنے نہ پایا تھا کہ چچا عزرائیل ایک دن شروع گرمیوں میں آپہنچے ویسے تو وہ ہمیشہ ہی میرے پیچھے ڈنڈا لیے پھرا کرتے ہیں لیکن اب کی بار ان کو اپنی ایک زبردست افسون کی پڑیہ میرے کھانے میں ملا دینے کا موقع مل گیا جب اُس کا اثر ہوا تو اول اول یہ سمجھا گیا کہ صرف سوہضمی ہے لیکن جب صبح سے شام تک اجابتوں کا سلسلہ نہ رُکا اور شام کو استفراغ بھی شروع ہوا تب سمجھ میں آیا کہ میاں ہیضہ خاں کی جھپیٹ ہے۔ دوا کا استعمال اب تک حکیم الملتاس کا تھا لیکن اب ساحرانِ قانونی کو پریشانی ہوئی اور سب کی رائے ٹھیری کہ سول سرجن کو بلایا جاوے۔ چنانچہ دو چرخۂ آہنی آزاد روپہ سوار ہو کر بیگانگی

تیز رفتار سکرٹری کالج - پرنسپل - اور سول سرجن کے پاس روانہ ہوئے - دم کے دم میں کالجی ڈاکٹر - سول سرجن - سکرٹری و پرنسپل آموجود ہوئے - اب ڈاکٹری دوا شروع ہوئی یہ جو اسی اگرچہ پہلے سے تھی لیکن اب غشی اور تشنج اعضاء کی سختی شروع ہوئی کبھی کبھی دو اک منٹ کے لئے باقتضائے ضرورت ہوش ہو جاتا تھا جب غشی نے اپنا زبردست ہاتھ دکھانا شروع کیا تو ساحر مولنا کو بلا کر یہ وصیت کی کہ میرا چھوٹا بکس سوائے میرے بڑے بھائی کے کسی کو نہ دیا جائے اور اُن کو ہدایت کر دی جائے کہ اس بکس کے سب کاغذات بلا پڑھے جلا دیئے جائیں جس کا آئندہ ایک عرصہ تک مذاق رہا -

رات بھر کرب - تشنج - استفراغ - اوراجابتوں کی سختی رہی سول سرجن کالجی ڈاکٹر کو دوا دے کر ہدایت کر گئے کہ ایک ایک چمچہ دودھ تھوڑے سے سوڈے کیساتھ رات بھر میں گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد دیا جائے اور جب پیاس معلوم ہو تو سُرخ دوا جو ایک بوتل میں اسی غرض کیلئے بنائی گئی تھی ہر مرتبہ دینے کیلئے ہدایت کی مگر آپ جانتے کہ کالج کا ہسپتال اور اُس کے اراکین نُورٌ علیٰ نور ہیں - چنانچہ رات کو دودھ سوڈا نہیں دیا گیا اور بوجہ حکم کالجی ڈاکٹر سُرخ دوا بہت ہی کم دی گئی صبح کو بدقسمتی سے ڈاکٹر صاحب کی نگاہ دودھ والے پر پڑ گئی اُسے فوراً بلا پاؤ بھر دودھ لے جس میں ہر قسم کا دودھ ملا ہوا تھا سوڈا ڈال کر ایک دم سے پلا دیا اور رات بھر جرعہ جرعہ دینے کی کمی اس طرح پوری کی گئی دوست احباب مخالفت کرتے رہگئے مگر ڈاکٹری کی وھوس میں اُنھوں نے کسی ایک کی نہ سُنی اب کیا تھا روئی میں آگ لگ گئی اور اجابتوں میں اضافہ ہونے لگا صبح جب سول سرجن دیکھنے آئے اور حالات معلوم کئے تو نہایت بگڑے اور کالجی ڈاکٹر سے لپاڈگی کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے مگر اب تو کام کاری ہو چکا تھا

اِس لئے احبابوں کا روکنا سخت دشوار ہوگیا اور ۱۲ بجے کے بعد میں بالکل بیہوش ہوگیا۔ سول سرجن نے دوبارہ آکر حکم دیا کہ مریض کی حالت سخت ردی ہے۔ اِس لئے اِس کو کالج شفاخانے پہنچاؤ اب چارپائی پر ڈال کر وہاں پہنچا یا گیا۔ جب چھ بجے شام تک کوئی افاقہ کی صورت نہ ہوئی تو سول سرجن نے کہا کہ اب کوئی علاج باقی نہیں ہے میں بے بس ہوں البتہ ایک نیا علاج اِن جکشن کا ہے اگر اس کا کوئی عزیز یہاں ہوتا تو اُس کی اجازت سے اُس کا عمل کرتا۔ اتفاقاً میرے بڑے ماموں دوپہر کی گاڑی سے علیگڈھ پہنچ گئے تھے اُنہیں یہ معلوم بھی نہ تھا کہ یہاں کا یہ رنگ ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے سول سرجن کو اُس عمل کرنیکی اجازت دی سول سرجن نے کہا کہ پندرہ منٹ کے اندر کالج ہسپتال سے شہر کے ہسپتال میں مریض کو پہنچایا جائے کیونکہ اِن جکشن کرنے کا سامان یہاں کافی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ زندہ مگر بصورت مُردہ چارپائی پر لیجایا گیا کالج کے درجوں کی اِس زمانے میں تعطیل تھی۔ صرف طلباء قانونی اپنی کمی پورا کرنے کیلئے روک لئے گئے تھے اور اِس لئے صرف طلباء قانونی میرے ساتھ تھے یہاں پہنچنے پر خوبی قسمت سے یہ معلوم ہوا کہ اِن جکشن سلیوشن کی ایک دوا نہ یہاں موجود ہے نہ انگریزی دواخانے میں دستیاب ہوتی ہے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ کالج کے سائنس لبریٹری میں وہ ضرور ملے گی چنانچہ قاصدانِ تیز رفتار پھر دو چرخہ آہنی آزادو پہ کالج روانہ ہوئے لبریٹری کی کُنجی نہ پروفیسر سائنس کے یہاں دستیاب ہوئی اور نہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے پاس نکلی جب کچھ بس نہ چلا الماری کے شیشے توڑ کر ایک سائنس کے طالب علم سے وہ دوا نکلوائی گئی اور سول ہسپتال پہنچائی گئی ڈیڑھ گھنٹہ اِن جکشن ہونے کے بعد یا بدست دیگرے دست بدست دگرے“ آپریشن روم سے باہر لایا گیا

اور مریضوں کے وارڈ کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا لیکن اب سرسامی کیفیت
شروع ہوئی اور ایکسو ساڑھے چھ ڈگری پر بخار پہنچ گیا کرنل ہیچنس سول سرجن
اور ڈاکٹر ماشاءاللہ اسسٹنٹ سرجن کے کہ جنہوں نے انجکشن کیا تھا کچھ دوا
دینے دلانے پر بخار کم ہوا مگر بخار بتدریج جیسا کہ چاہیئے تھا نہ گھٹا بلکہ ایک دم سے
تین ڈگری گھٹ گیا تھوڑے ہی وقفہ کے بعد پھر ایک سو ساڑھے چھ ہو گیا
اس پر ڈاکٹر صاحبان کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے مگر فوراً ہی اُنہوں نے
آئیس باتھ کی تجویز کی چنانچہ سر پر برف بندھنا اور تمام بدن کا آئیس باتھ
ہونا شروع ہوا چار بجے تک حالت نارمل ہو گئی اور ایک دم آنکھیں
کھل گئیں صبح کو بیشتاب ہوا جو دو رات اور ایک دن سے بند تھا سول سرجن
نے آکر نبض دیکھی اور شفایابی کی مبارکباد دی۔ چچا عزرائیل اپنی پڑیا کا اثر
زایل ہوتے ہوئے دیکھکر نہایت برہم ہوئے مگر حکم خداوندی سے لاچار تھے
زمانۂ بیماری میں جو ہمدردی کہ کالج کے طلبا اور پروفیسروں نے کی اور جو
خدمت کہ ڈاکٹر صاحبان ہسپتال شہر اور کمپونڈر عظیم الدین ہسپتال کالج
نے کی وہ دنیا میں نادر المثال ہے چنانچہ جس روز سے میں بیمار ہوا تھا بلا اپنی
صحت کے خیال کے قانونی طلبا کا یہ حال تھا کہ نہ اُنہیں اپنے کھانے کی
فکر تھی نہ سونے کی تین تین طالب علموں کا پہرہ ہر دو دو گھنٹے بعد بدلتا تھا
اور دن رات میں میں کبھی تنہا نہیں رہا خود ہی یہ لوگ برف توڑتے تھے
اور دوا اور سوڈا پلاتے تھے اور بار بار ٹمپریچر لیتے تھے اور ہر وقت ہر خدمت
کے لئے موجود تھے مولانا عبدالخالق پروفیسر قانونی اور میرے عزیز دوست
ایک طرف تو میرے مہمانوں کی مہمانداری میں مشغول رہتے اور دوسری
جانب بیمارداری کرتے تھے خواجہ عبدالمجید بیرسٹر ہر وقت گاڑی پر سوار

کبھی سوڈے کی بوتلیں کا بستے لا رہے ہیں کبھی مرغیوں کے بچوں کی تلاش میں محلے در محلے مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور کبھی میرے پاس بیٹھے ہوئے تسلی آمیز گفتگو کر رہے ہیں غرضکہ طالب علم ہوں یا پروفیسر ڈاکٹر ہوں یا کمپوڈر سکریٹری ہوں یا ممبران اسٹاف اُنھوں نے انسانی ہمدردی کا اِس موقع پر وہ بے نظیر ثبوت دیا کہ میرے دل پر اُن کے احسان کے گہرے نشانات تمام عمر تک مٹیں گے اور یہ ہمدردی دُنیا میں اِس طرح آفتاب بن کر چمکے گی کہ جو دوسروں کیلئے ضرب المثال ہو گی میرا قلب اُن کی اِس ہمدردی سے استحساناً بھرا ہوا ہے اور ہمیشہ بھرا رہے گا محسن علی کلکتوی۔ حافظ بشیر احمد۔ صابر علی شروانی مشتاق احمد خاں۔ عبدالغنی انصاری۔ سید نواب حسن اور اور دیگر طلباء قانونی کی عنایت و ہمدردی میرے دل پر نقش کالحجر ہے۔ خدا کرے کہ مادر کالج کے سیکڑوں ایسے ہی ہمدرد سپوت پیدا ہوں کہ جو چار دانگ عالم میں اپنا سکہ جماویں :۔

باب دہم

دیگر واقعات دلچسپ

کالج پر بجلی ۱۹۰۸ء میں ایک روز رات کو آسمان پر خوب ابر چھا گیا اور بادلوں کی گرج بجلی کی چمک اس روز ایسی بھیانک تھی کہ دل کانپ کانپ جاتا تھا۔ اندھیرا اِس قدر چھایا ہوا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا تھا کالج میں ایک سناٹے کا عالم تھا کچھ باہر برآمدے میں اور کچھ اندر کمرے میں سو رہے تھے۔ البتہ کہیں کہیں بات کرنے والی ٹکریاں بولتی چالتی نظر آتی تھیں

ایک بجا ہوگا کہ یکایک بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک وتڑپ میں ایک خاص زیادتی پیدا ہوئی۔ اور ایک دفعہ ہی بجلی ایسی زور سے تڑخی کہ کل کالج بقعۂ نور ہوگیا۔ اور سونے والے سب گھبراکر جاگ اُٹھے۔ ابھی پوری طرح ہاتھوں میں دل نہ آنے پایا تھا کہ ایک دفعہ اور بجلی اس زور سے کڑکی اور تڑپی کہ تمام کالج اور کمروں میں روشنی ہی روشنی ہوگئی ہر شخص یہ سمجھا کہ اُسی کے کمرے پر بجلی گری اُس وقت ہر شخص کا یہ حال تھا کہ دل قابو میں نہ تھا دماغ کام نہ دیتا تھا زبان کو یارا نہ تھا کچھ لوگ جو بسترے برآمدے سے لیکر اندر بھاگ رہے تھے دروازے ہی پر بے ہوش ہو کر گر پڑے کچھ چارپائیوں پر بیٹھے بیٹھے رونے لگے۔ بعض چارپائیوں کے نیچے خوف کے مارے گھس گئے کچھ حضرات جو سائنس پڑھے ہوئے تھے بکس کھولکر اُس میں اچکن زیب تن کرنے لگے کسی صاحب نے لمپ پر جلدی سے ریشمی کپڑا ڈال دیا کچھ حضرات چارپائیوں پر پڑے بے حس وحرکت سکتے کے عالم میں ہوگئے ایں جانب پچھلی بارگ میں پچھلے کمرے میں سو رہے تھے جب یہ صور قیامت پھونکا تو دل تھر تھر ہونے لگا دلائی جو اوڑھے ہوئے تھا اُس کا ابرا سیاہ اور استر تا سیاہی رنگ کا تھا۔ سنتے آئے تھے کہ بجلی سیاہ چیز پر بہت گرتی ہے چنانچہ یہ خیال آتے ہی فوراً ہی رضائی کا رُخ بدل دیا اور یہ خیال بھی نہ آیا کہ ماشاء اللہ جسم کا رنگ بھی کچھ اُجلا نہ تھا۔ یہ ہمت تک نہ ہوئی کہ چارپائی سے اٹھکر دروازہ بند کردوں یا دوسرے کمرے میں چلا جاؤں۔ غرضکہ یہ رات بھی عجیب رات تھی۔ اور قیامت کا ایک نمونہ نظر آرہا تھا صبح کو نماز کو جب ناظم دینیات اُٹھے اور انھوں نے نظام میوزیم میں جو مسجد کے قریب تھا خلاف معمول روشنی دیکھی اور اُس کے استفسار کے لئے آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کمرے کے

اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ پھر تو لڑکے بیدار کئے گئے۔ اور ارکین کالج کو اطلاع کیگئی بہشتی مشکیں بھر بھر کر آگ بجھانے لگے اور طالب علموں نے سامان نکالنا شروع کیا ڈاکٹر ضیاء الدین جو آئے تو تمام کمرے کو سونگتے پھرے کہ کس جگہ پر صدمہ ہوا ہے اور بجلی کی پہنچ کس طرح اندر ہوئی کنڈر گارٹن کا نہایت اعلےٰ سامان جس کو ڈاکٹر موصوف نے بڑی زحمت سے جمع کیا تھا وہ ستثنا چند چیزوں کے جل کر خاک ہو چکا تھا یہ عالم دیکھکر بے ساختہ اُن کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے کسی نے آکر خبر دی کہ نہ صرف اِس کمرے پر بجلی گری ہے بلکہ منٹو سرکل بھی یہ واقعہ ہائلہ پیش آیا ہے یہ سنتے ہی بائسکلوں پر سوار لوگ اُدھر بھاگے گئے مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی شہر میں اِس کی خبر پہنچتے ہی جوق کے جوق لوگ کئی روز تک اِس کمرے کو دیکھنے آتے رہے کوئی ہاتھ لگاکر دیکھتا کہ بجلی سے کمرہ کس قدر گرم ہو جاتا ہے کوئی اُس کے آلے اور غائب ہو جانے کی جگہ دیکھتا غرضکہ یہ بھی ایک تماشہ تھا کہ جس کا تین چار روز تک چرچا رہا

بھیا تنہا کا ڈٹ ہونا
(خطاب عطا ہونا)

ایک صاحب متخلص بہ تنہا کالج کی الف۔ا ے کلاس میں داخل ہوئے آپ مشکیں رنگ پہاڑی ٹٹو جیسا قد واقع ہوئے تھے وہ تمام صفات جو ایک بھیا میں ہونی چاہیئے تھیں کما حقہ ان میں موجود تھیں آپ شاعر بھی تھے اور اکثر اوقات اِسی شغل میں منہمک رہتے تھے یاران طریقت نے کہا کہ میاں یہ بھیا کے خطاب سے مفتخر کئے جانے کے قابل ہیں چنانچہ پکی بارک کمرے نمبر ۳ میں اُن کے ڈٹ کئے جانے کیلئے ایک عام جلسہ منعقد ہوا کمرا سجا ہوا تھا جا بجا لمپ روشن تھے کمرے نمبر ۳ سے کمرہ نمبر ۱۲ تک بیچ سے کھلنے والے دروازے کھول دیئے گئے تھے اور ہر دروازے میں ایک ایک خوبصورت لمپ روشن کر کے

رکھ دیا گیا تھا۔ ایک لکڑیوں کا تاج بنا کر اُن کے سر پر رکھا گیا اور اُس تاج میں
چمڑے کے ٹکڑے طرّوں کی جگہ آویزاں کئے گئے تھے۔ گلے میں لکڑیوں کے
ٹکڑوں کنر اور کیکر پھلیوں کا ہار ڈالا گیا تھا۔ ایک صاحب نے اُٹھکر سب سے پہلے بھیا بہادر
کا حاضرین جلسہ سے تعارف کرایا اور اُس کے بعد پُر مذاق تقریروں اور پُر لطف
نظموں کا نمبر آیا بعدہ مٹھائی منگوائی گئی اور وہ کھا پی کر اس شان سے رخصت
کئے گئے کہ دو آدمیوں کے ہاتھوں پر وہ معلق تھے تیسرا آدمی اُن پر مور چھل
جھل رہا تھا برآمدے میں تیسرے نمبر سے کرڈ ائننگ ہال تک دو طرفہ
ساحران فسوں ساز صف بستہ تھے اور ہر چوتھے ساحر کے ہاتھ میں ایک لیمپ تھا
کہ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں جانب لمپوں کے پوسٹ چار چار قدم پر
گڑے ہوئے ہیں ڈائننگ ہال کے دروازے پر پہنچتے ہی یہ جلوس منتشر ہو گیا

مشاعرۂ اُستاد منیر اس کی بنا اس طرح پڑی کہ پنجاب سے ایک صاحب
فتح محمد نامی کالج میں وارد ہوئے اِن کو لوگ ڈاکٹر
کے نام سے پکارتے تھے اِن صاحب کو شاعری کا خبط تھا یوں تو شاعری میں
الف کے نام ب بھی نہ آتا تھا لیکن اس پر بھی آپ کو فن شاعری میں بہت
غرہ تھا اور ڈاکٹر اقبال کو خوامخواہ اپنا استاد بتاتے تھے آپ کا کوئی شعر ایسا نہ
ہوتا کہ جس میں دو چار سکتے نہ ہوں اور جو مہمل نہ ہو اگر کسی نے اعتراض کیا
تو فوراً جواب ہوتا کہ آپ کیا جانیں ڈاکٹر اقبال نے اِس غزل کی تعریف کی
ہے غرضکہ غریب اقبال کی ہر طرح مٹی خراب ہوتی تھی اکثر اشعار کی یہ بھی
شان تھی کہ اگر ایک مصرع بحر مل میں ہوتا تھا تو دوسرا بحر رجز میں اُن کا
یہ رنگ جب دیکھا گیا تو بدرالحسن ممبوق اور دیگر حضرات نے یہ ارادہ کیا
کہ ایک مشاعرہ قایم کیا جائے اور اُس میں تفریحاً ڈاکٹر کی غزلیں بھی ہوا کریں

اور باقی مشاعرے میں سنجیدہ اور پرمغز کلام ہوا کرے۔ چنانچہ بدرالحسن بمبوق کا تعارف ڈاکٹر سے اس طرح کیا گیا کہ آپ پرانے اُستادوں میں سے ہیں۔ آپ کا تخلص منیر ہے جن کے دیوان آپ کی نظر سے ضرور گذرے ہوں گے یہاں آپ کا ایک مشاعرہ ہوتا ہے آپ بھی اُس مشاعرے میں رونق افروز ہوا کریں اور اپنی غزل سے مشاعرے کی رونق بڑھائیں چنانچہ یہ طے ہوتے ہی مشاعرہ منعقد ہونے لگا۔ کالج کے سب شاعر ولایت علی بمبوق کے کمرے پر جمع ہوتے اور خوب غزلیں ہوتیں ڈاکٹر کی غزل اُسی شان میں ہوتی اور دو اک شرارت پارٹی کے ممبر اُسی طرز میں غزل لکھکر اُن پر خوب فقرے اڑاتے یہ مشاعرہ ایک عرصہ تک قایم رہا طلباء کالج خوب اِس میں دادِ سخن دیتے اور بڑی بڑی پھڑکتی ہوئی غزلیں یہاں ہوتیں اور کبھی کبھی نفس شاعری پر بھی اچھے اچھے بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے لیکن افسوس کہ اُن کے قلمبند کرنیکا خیال اُس وقت کسی کو نہ تھا اور وہ غزلیں اب باوجود تلاش کے بھی ہاتھ نہیں آتیں :-

گھوڑا شاہ | ایک صاحب تو عمر علیگڈھ کے باشندے کوسٹل فیکٹری علیگڈھ میں ملازم تھے صورت و لباس میں بالکل ملا سے اور ضرورت سے زیادہ سیدھے واقعہ ہوئے تھے پڑھنے لکھنے سے تو کچھ دلچسپی نہ تھی مگر نہ معلوم کس طرح اُن کو کالج سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور چند ساحرانِ کالج کے پاس اُن کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا رفتہ رفتہ کالج میں ساحران سے واقف ہوتے گئے اور وہ تختہ مذاق ہو گئے جنمیں سے عبدالستار صدیقی اور منصور کو اُن سے زیادہ دلچسپی تھی جب اُن کی باتیں سننے میں آئیں تو رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ سادہ لوح ہونے کے علاوہ

حضرت کو یہ بھی خیال ہے کہ میں ولی ہوں۔ چنانچہ اب منصور اور ستار نے
اُس میں ولایت کی روح پھونکنی شروع کی۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اُنہیں کامل یقین
دلا دیا کہ وہ قطب ہیں ایک روز منصور نے کہا کہ میاں گھوڑا شاہ رات میں نے
خواب دیکھا ہے کہ جرمنی میں ایک ولیہ ہے جس کا نام مس شاعرین ہے وہ
تم کو بلا رہی ہے اور تم سے عقد کرنا چاہتی ہے۔ آپ بولے ہاں مجھے بھی
خواب میں وہ ملی تھی اور میرا ارادہ ہے کہ میں اُن سے ملنے جاؤں لیکن یہ تو
بتاؤ کہ جرمنی کو کس طرف سے جاتے ہیں منصور نے کہا کہ میاں سٹرک زکوئے
محمد سے چلے جاؤ کھلا ہوا راستہ ہے آپ نے کہا کہ اچھا نوکری چھوڑتا ہوں اور
بیوی سے کہتا ہوں کہ اپنے میکے چلی جاؤ ہم مس شاعرین کے پاس جائیں گے
غرضکہ منصور اور ستار مس شاعرین کی تعریفیں کرتے تھے اور اِن کا اشتیاق
مُلاقات روز بروز تیز ہوتا تھا اتنے ہی میں منصور کو عربی کی تعلیم کے لئے
جرمنی جانے کے لئے وظیفہ ملا ستار نے اُن کو بہکایا کہ دیکھو تمہارے لئے مس شاعرین نے
روپیہ بھیجا ہے منصور اپنے بھائی منظور کی سازش سے اُس کو خود اڑانا چاہتے
ہیں۔ اور برسر صاحب اور بابو رفیع اللہ صاحب نے کچھ حصہ لے کر اُس میں
تمہارے ساتھ دغا کی ہے پھر کیا تھا ایک تو کریلہ پھر نیب پر چڑھا اب
جس سے ملتے ہیں اُس سے شکایت کرتے ہیں کہ دیکھو صاحب سب نے
منصور سے رشوت لے کر میرا روپیہ اُسے دلا دیا اور وہ ہمارے دوست
بنتے تھے ہم کو فریب دیکر مس شاعرین سے ملنے جاتے ہیں۔ مگر کہیں وہ
اُن کے قابو میں آنے والی ہے وہ تو خواب میں مجھے دیکھکر عاشق ہو چکی
ہے ستار نے بتلایا کہ بابو صاحب سے کہو کہ وہ اِس معاملے کو سلجھا دیں
وہ بابو صاحب کے پاس گئے اُنہیں سب قصہ معلوم تھا اُنہوں نے کہا کہ

مری طرف جو تمہارا خیال ہے۔ وہ غلط ہے میں ہر طرح حاضر ہوں ضرور کوشش
کروں گا۔ ستار نے اُنہیں پھر بھڑکایا کہ یہاں یوں کام نکلتا نظر نہیں آتا تم
ڈاکٹر ہارورز کے پاس جاؤ وہ جرمنی کے رہنے والے ہیں کچھ سبیل نکالیں گے
باؤ لے کو ایک بات سکھانے کی دیر تھی کہ وہ ڈاکٹر موصوف کے پاس پہنچ گئے اوّل تو
وہ اردو زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور پھر اُن کی یہ بے تکی باتیں وہ بیچارے خاک نہ
سمجھے اور چونکہ فطرتاً نیک واقع ہوئے تھے اس لئے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اچھا تم جاؤ۔
سب کام ہو جاویگا وہ سمجھے کہ یہ شخص دیوانہ ہے کسی نے یہ تجویز سمجھا دی کہ تم گورنر
جنرل کو تار دو کہ کالج کے حساب والے مرا روپیہ کھا گئے جن دو چار لوگوں کے
پاس فارم لکھوانے گئے اُنھوں نے کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیا اب طرفہ ماجرا
یہ ہُوا کہ ستار کو جرمنی جانے کیلئے گورنمنٹ سے وظیفہ ملا۔ انہیں جو خبر ملی تو
نہایت بگڑے اور کہنے لگے کہ جسے دوست سمجھتے ہیں وہی دشمن نکلتا ہے۔ دیکھو
ستار کو کہ اُس نے بھی رشوت کھائی اور جو روپیہ میرا باقی تھا اُس کو لے کر
وہ جرمنی بھاگ گئے ستار کے جانے کے بعد یہ ادھر اُدھر شکایت کرتے
پھرنے لگے منصور اور ستار کی اب تک شکایت کرتے ہیں اور اُن پر یہ
رنگ اب تک چڑھا ہُوا ہے البتہ کالج میں آنا جانا اب کم ہو گیا ہے۔

ٹرسٹی بننے کا خبط

۱۹۱۲ء کا یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک
صاحب جو خاندان شروانی میں سے تھے اُن کو یہ
خبط ہُوا کہ اگر میں کالج کا ٹرسٹی ہو جاؤں تو کالج کے لئے نہایت مفید ہو گا
چنانچہ اکثر لوگوں سے وہ کہتے کہ میاں کالج کے لوگ عجب بودم ہیں کہ مجھ جیسے
کارآمد آدمی کو تو ٹرسٹی بناتے نہیں اور خواہ مخواہ ایرا غیرا نتھو خیرا کو ٹرسٹی بنا تے
جاتے ہیں چنانچہ خواجہ مجید کو ٹرسٹی بنانے کی کوشش ہے اتفاق سے اڈیٹر

انسٹیٹیوٹ گزٹ نے جن کے پاس وہ اکثر آتے تھے اُن کی ملاقات کچھ طلباء قانونی سے کرائی جس میں ساحر بنگالہ میاں محسن علی بھی تھے۔ کچھ ہی دنوں کی ملاقات کے بعد اُن سے بے تکلفی ہو گئی اور وہ کھل گئے اور یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اُن کا دماغ اب نارمل حالت میں ہے اور ٹرسٹی شپ کے خبط میں بے طرح مبتلا ہیں۔ چنانچہ قانونی ہاؤس کی شرارتی پارٹی کا بصدارت محسن علی جلسہ ہوا اور ہر ایک پروفیسر قانونی جو تقریر پروفیسری سے قبل اِس جلسہ کے اراکین کے خاص دوستوں میں تھے بطور پیٹرن کے رکھے گئے۔ تجویز ہوئی کہ صابر شروانی رکن جلسہ کو اس امر پر تعینات کیا جاوے کہ وہ اور اڈیٹر انسٹیٹیوٹ گزٹ اِن صاحب کے دل میں یہ ذہن نشین کر دیں کہ محسن علی اور اُن کے دوستوں کو اپنی طرف کر لیا تو ٹرسٹی ہوئے رکھے ہو اُس کے بعد اُن پر اور مختلف قسم کے جال ڈالے گئے کچھ ٹرسٹی صاحبان کو اپنی طرف کیا گیا اور کچھ ممبران اسٹاف کو شریک کیا خواجہ مجید صاحب سے ٹھیرائی کہ وہ ٹرسٹی شپ سے ایک دست برداری اُن کے حق میں لکھیں چنانچہ یہ تجویزیں ہو کر عملی کارروائی شروع ہوئی۔ اڈیٹر انسٹیٹیوٹ گزٹ اور صابر علی شروانی اپنی تحریک میں کامیاب ہوئے اور ان صاحب سے محسن علی اپنے ٹرسٹی بنا دیئے جانے کی سلسلہ جنبانی شروع کی انھوں نے اوّل تو مشکلات بیان کیں۔ اور پھر وعدہ کیا کہ میں ضرور ساعی ہوں گا چنانچہ خواجہ عبدالمجید کی لکھی ہوئی دست برداری اپنی بے حد کوششوں کا اظہار کر کے ایک عرصہ کے بعد اُن کے سامنے پیش کی۔ اب کیا تھا جادو کا اثر اُن پر شروع ہوا اور وہ گھومنے لگے اتفاقاً وہ ایک ٹرسٹی کے پاس گئے اور یہ تذکرہ کیا کہ میں اب ٹرسٹی ہونے والا ہوں خواجہ صاحب میری وجہ سے دست بردار ہو گئے میرے دوستوں نے اُن کو اس پر مجبور کر دیا حاجی ٹرسٹی کے گوش گذار یہ معاملہ صابر علی اور

ایڈیٹر انسٹیٹیوٹ گزٹ کر چکے تھے۔ انہوں نے کہا بہت مناسب ہے خدا مبارک کرے حُسن اتفاق سے ایک روز مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم علیگڈھ آئے ہوئے تھے اُن کے پاس ہی اِن صاحب کو بھیجا گیا۔ صاحب موصوف نے جب اِن کی باتیں سنیں تو بہت ہی حیران ہوئے اور اُن سے پیچھا چھوڑانے کی خاطر کہدیا کہ بہت بہتر میں کوشش کرونگا ادھر یہ وار ہو رہا تھا اور دوسری طرف محمڈن کالج کلب میں اِس قسم کا روغن قاز اُن پر ملا جارہا تھا اب اُن کو یقین کامل ہوگیا۔ کہ بہت سے ٹرسٹی اِن کے موافق ہیں کچھ عرصہ بعد شرارت پارٹی کے ممبران نے یہ ظاہر کیا کہ ہم لوگ چار روز تک باہر اسی کام کیلئے دورہ لگاتے رہے اور اکثر ٹرسٹیوں سے آپ کے حق میں ووٹ دینے کا وعدہ لے لیا ہے غرض اِس طرح ایک عرصہ تک سلسلہ جاری رہا اور ایک روز تجویز کر کے اُن سے کہدیا گیا کہ ٹرسٹیوں کا جلسہ ہوگیا اور آپ ٹرسٹی منتخب ہو گئے۔ لیکن اعلان کا قاعدہ اُس وقت تک نہیں ہے جبتک کہ آپ ایک ڈنر نہ دیں اور اُس میں خاص خاص آدمی مدعو نہ کئے جاویں اُسی ڈنر کے موقع پر آپ کو ٹرسٹی ہونے کی سند عطا کی جاوے گی اور آپ ٹرسٹی ڈب ہو جائیں گے چنانچہ اُن سے کچھ روپیہ لیا گیا اور ایک خاص ڈنر طلبا، قانونی کا جس میں دو ایک کالج اسٹاف کے ممبر اور دو اک ٹرسٹی مدعو کئے گئے ہوا سند اِس طرح تیار ہوئی کہ ایک کاغذ آنریری سکرٹری کے یہاں کا جس پر نہایت خوبصورت نج بنا ہوا تھا منگایا گیا اور اُس پر ایک مذاقیہ انگریزی کا مضمون لکھا گیا سرخ فیتے لگا کر اُس پر لاکھ کی مہر بجنسہ ایسی لگائی گئی جیسی کہ بیرسٹری کے ویلیوؤں میں ہوتی ہے اور ایک خوبصورت سالٹو اُس میں آویزاں کیا گیا رنگ برنگ کے کپڑے کی ایک ٹوپی بذریعہ خواجہ صاحب گوٹے کی تیار

کرائی گئی۔ اور اس میں معمولی پیپر نگے موتیوں کا طرّہ لگایا گیا۔ جس روز یہ ڈنر ہوا۔ سوسائٹی کا بڑا کمرہ خوب سجایا گیا تھا۔ اور علیگڈھ کے ایک رئیس سے کہ جن کے یہاں سب سے اونچی کرسی تھی اور جو کھانے کی میز سے ایک فٹ اونچی رہتی تھی۔ اُن کے لئے منگائی گئی میزیں معمول سے زیادہ سجائی گئیں اور ان صاحب کی کرسی صدر میز کے بیچ میں ایک تخت کے اوپر رکھی گئی اور ٹوپی پہنا کر اُن کو صدر میں بٹھایا گیا سند طیار شدہ خواجہ صاحب لے کر اُن کے پاس بیٹھے کھانا کھانے کے بعد تقریروں کا نمبر آیا اور سب سے آخر میں اُن کی تقریر ہوئی کہ جس میں اُنھوں نے اپنی پالسی کا اعلان کیا تھا غرضکہ خوب مضحکہ آمیز تمسخرانہ اور پُرلطف اسپیچوں کے بعد یہ جلسہ اس طرح ختم ہوا کہ اُن سے کہا گیا کہ کرسی پر ایک گھٹنا ٹیک کر جھک کر کھڑے ہو جیے اور اُس سند کا فیتہ اُن کے گلے میں لٹکا دیا گیا اور پُرانے بانس کے ڈھڈ کرے سے اُن کی کمر میں تین خفیف ضربیں دی گئیں اور اعلان کر دیا گیا کہ اب آپ انگریزی قاعدے سے ٹرسٹی ڈب ہو گئے اِس پر حاضرین جلسہ میں خوب فرمایشی قہقہہ پڑا اور سب ہنسی خوشی روانہ ہوئے :۔

عقیقہ ۱۹۰۵ء میں بہار سے ایک صاحب تشریف لائے جو چھوٹے رکھے ہوئے تھے شرارت پارٹی کی کیبنٹ نے یہ تجویز کی کہ ہندوستانی رسم کے مطابق اِن کا عقیقہ کیا جائے چنانچہ ایک صاحب کی طرف سے جمعہ کے روز رسم عقیقے کے دعوتی کارڈ تقسیم کر دیئے گئے لیکن اِن صاحب کو لاعلم رکھنے کے لئے اُس میں کسی کا نام نہیں دیا گیا بعد نماز جمعہ کالج کے ڈائننگ ہال سے چند دیگیں منگوا کر صحن کالج میں اُن کے کمرے کے سامنے ہمبری اینٹوں کے چولھے بنوا کر رکھوا دیں اور اُس میں خالی ڈوئی چلانے کا

حکم دیا۔ کالج کے باورچی خانہ میں جو قیمہ ہونا تھا اُس کا گوشت منگوا کر ملازم باورچی خانہ سے وہیں قیمہ کوٹنے کی ہدایت کیگئی۔ اُس تمام حصہ بیرک میں فرش بچھایا گیا۔ گاؤ تکیے مہیا کئے گئے اور حقہ سگرٹ پان عطر سے تواضع ہوئی۔ یہ صاحب جس شخص سے پوچھتے ہیں وہ یہ کہکر خاموش ہوجاتا ہے کہ ابھی خود ہی دیکھ لیجئے گا کہ کیا ہوتا ہے چنانچہ ساحر صاحب خان کیل کانٹے سے درست بموجب ہدایت وقت مقررہ پر آ پہنچے اور طلبا کے مجمع سے ایک صاحب نے جنہوں نے ان کے بزرگ ہونے کی حیثیت سے دعوتی کارڈ تقسیم کئے تھے ایک پر لطف تقریر کی اور اس کے بعد پر مذاق نظمیں خاص تعداد میں پڑھی گئیں اور سب سے آخر میں ان صاحب سے یہ استدعا کی گئی کہ آپ پٹھے کٹوا دیجئے اس پر وہ اسقدر بگڑے کہ غسل خانہ میں گھسکر لوگوں پر پانی اور گلاس و لوٹے پھینکنے لگے آخر یہ وعدہ لے کر ان کو چھوڑ دیا گیا کہ کل وہ پٹھے ضرور کٹوا دیں گے

آئینہ

نومبر ۱۹۱۱ء میں چند طلبہ نے خفیہ طریقہ پر ایک پرچہ "آئینہ" کالج کے حالات پر نکالنا شروع کیا یہ اگر کالج کے طلبا اپنا ایک پرچہ نہایت عمدہ اصولوں پر علانیہ شایع کریں نہایت ہی خوشی کا امر ہے لیکن اس پرچے کے نکلتے ہی یہ امر واضح ہوگیا کہ یہ پرچہ اچھے اصولوں پر جاری نہیں کیا گیا تھا صرف ذاتیات کی بنا پر اس پرچے کی اشاعت تھی جب اس میں نازیبا حملے ممبران اسٹاف اور دیگر طلباء کالج پر شایع ہونے لگے تو اراکین کالج نے خود اور باستعانت پولیس اس امر کی تحقیقات شروع کی کہ یہ کیا چھپتا ہے اور کون اس کے منتظمین ہیں لیکن اس تفتیش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا البتہ یہ ضرور ہوا کہ آئینہ کا چھپنا بند ہوگیا میرے خیال میں اگر یہ اخبار علانیہ طور پر مستقل اور مفید اصولوں پر ذاتیات سے پاک شایع کیا جاتا تو یقیناً کالج کے لئے مفید ہوتا ٹائٹل پیج کا عنوان دلچسپ ہے اس لئے ہدیہ ناظرین ہے

"چندہ سالانہ" ایک نگاہ - اڈیٹر حیدر آئینہ ساز مسیب اڈیٹر صیقل عکس فکر خان یوشی

جلوہ نما جائے اشاعت شہر حلب محلہ شیشہ گراں"
اس کا پہلا جلوہ ۱۵۔ نومبر ۱۱ ۱۹ء کو شائع ہوا تھا۔

اِس سلسلہ کلام میں وہ دن بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس روز انسٹیٹیوٹ گ
میں نواب وقار الملک بہادر کی عام پالسی چھپی تھی کہ جس کے چھپتے ہی کالج اور بیرو ن
کالج کے مختلف حلقوں میں ایک کھلبلی مچ گئی تھی اور بعض نے تو یہاں تک جرات
کی کہ اس کے خلاف مضامین تک لکھنے شروع کئے مگر حق کا ہمیشہ بول بالا رہتا ہے
اس پالسی کے خلاف راست بازانہ طریقے پر کچھ بھی نکتہ چینی نہ ہو سکی :۔

باب یازدہم

زندہ باد کالج پائندہ باد کالج

۱۹۱۳ء میں سوسائیٹی سے صاحب باغ منتقل ہوا یہاں ساحرہ "عزیز" کیساتھ
ایک کمرے میں اوپر کی منزل میں جگہ ملی اگرچہ کالج میں سب سے پہلے یہ صاحب ایم۔اے
میں داخل ہوئے مگر قومی جوش میں یہ کسی سے کم نہ تھے آل انڈیا میڈیکل مشن میں یہ بھی
گئے تھے اور برادران اسلام یعنے کہ ترک زخمیوں کی بیمارداری میں انہوں نے
کما حقہ حصہ لیا اور اسلامی سلطنت کے مرکز و مستقر کی زیارت اِس شان سے کی کہ جو
آئندہ نسلوں کو مشکل سے حاصل ہو گی۔ اِس زمانے میں درسگاہ سحر آموز میں بوجہ لڑائی
بلقان و مصیبت ایران قومی روح کی گرمی اور جوش بڑھے ہوئے تھے کبھی تو خوشگوار
چیزیں سنکر مردہ جانوں میں روح پڑ جاتی تھی اور کبھی خبر بد سنکر دل پاش پاش ہو جاتا
تھا ترک اور ایرانی مصیبت زدگان کیلئے چندے جمع کئے جارہے تھے اور ان میں
اِس قدر سرگرمی دکھائی جارہی تھی کہ پلاؤ اور ایک وقت کا گوشت طلباء کالج نے
چندہ بڑھانے کی خاطر کھانا ترک کر دیا تھا اور تمام اشتغال تفننی ڈرامہ اور ریاریٹیو گ

خیرباد کہدیا تھا۔ نوبت یہانتک پہنچگئی تھی کہ رات ودن مسجد کی طرف بھاگے چلے جاتے
تھے۔ ہر طرف لوگ اپنے معبود کے سامنے سجدے میں پڑے ہوئے جبینِ نیاز کو گھستے
ہوئے نظر آتے تھے۔ اور فتح اسلام کیلئے رو رو کر دعائیں مانگتے تھے۔ کالج کے
ارا کین نے یہ حال دیکھ کر مختلف شکلوں سے اِس جوش کے قطعی دبا دینے کے لئے تدبیر
شروع کیں اور بیرونی بہی خواہاں کالج۔ کالج میں آ آکر طلبہ کو وعظ دینے لگے
اُسی زمانے میں راجہ صاحب محمود آباد بھی علیگڈھ تشریف لائے اور اُنہوں نے طالبعلموں کو
بلاکر طالب علمی میں ایسے جوش دکھانے سے احتراز رکھنے کی تلقین کی اور یہ بھی فرمایا
کہ دماغی محنت کیلئے یہ ضرور ہے کہ تم اپنے کھانے میں کمی نہ کرو میں اس کے لئے
بالکل طیار ہوں کہ گوشت اور پلاؤ کے چھوڑ دینے سے جس قدر روپیہ ماہوار فراہم
ہوتا ہے اُس قدر میں تا اختتام جنگ بلقان و مصیبت ایران دیتا رہوں گا لیکن
یہ اس پر راضی نہ ہوئے اگرچہ میرے خیال میں وہ حالات وواقعات جو کالج کے
طالبعلموں کی زندگی کے میرے زمانے میں گذرے ہیں اُن سے قطعی طور پر یہ امر
ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ کالج کے افراد قومی یعنے کہ طلبا، کالج میں حقیقی روح
کی ہمدردی حمیت اسلام کا نام تک نہیں اور یہ واقعات کہ جو اخباروں کے
کالموں میں موٹے حرفوں سے نظر آتے ہیں بالکل ہانڈی کے اُبال کی مثال اور واقعات
ہیں اس زمانہ پر تکلیف میں فوری جوش میں جو حرکات کالج کے طالبعلموں سے
ہوئیں وہ قطعی اس کا ثبوت دیتی ہیں کہ وہ خود دار باحمیت اور صریح زندہ
افراد ہرگز نہیں اور حقانیت کوسوں دور ہے خدا بھلا کرے ہمارے سول
کے رہنے والوں کا اور چند ممبران اسٹاف و ٹرسٹیز کا کہ اُنہوں نے سطحی واقعات
بزدلی سے خواب نا رکھا ہے۔ چنانچہ اس موقع پہ ہز آنر علیگڈھ تشریف لائے
اُنہوں نے فرمایا کہ موجودہ واقعات کالج کچھ اس طرح میرے سامنے پیش

ہوئے ہیں کہ مجھے بڑا فکر تھی کہ میں کالج پہنچوں اور اسی وجہ سے میں عجلت کے ساتھ
یہاں آیا۔ اور افسوس ہے کہ کالج کے اور شعبوں کو اس وقت تفصیل کے ساتھ نہیں دیکھ
سکتا اور اس وقت صرف کالج کی زندگی پر نظر ڈالنے اور طلبہ کالج کو مفید اصلاح
دینے کیلئے میں نے علیگڈھ کا سفر اختیار کیا ہے لیکن صاحب ممدوح کالج کے
حالات سے مطمئن ہو کر تشریف لیگئے اگر صاحب ممدوح کو صحیح اخبار کالج موصول
ہوئے تو یقیناً اُن کو اِس تکلیف کے کرنے کی ضرورت نہ پڑتی کالج کے علماء اعلیٰ
پر پہنچ کر طلسم ہوش ربا کی چہار دیواری سے نکل اپنے اپنے کرشموں کا اثر دُنیا میں
پھیلانے کے لئے کامیاب ساحروں کے غول کے غول ادھر اُدھر روانہ ہوئے
بندہ کچھ عرصہ تک اک طلسمی نگینہ بنانے کی فکر میں اِس قدر غلطاں اور پیچاں رہا
کہ دُنیا اور ما فیہا کا خیال نہ رہا اس فکر سے نجات پاکر اب ایک جگہ دِل مراد آباد
کرنے کے لئے منڈھی بنا کر بیٹھا ہوں اور دُنیا کے کرشمان فسوں ساز کا اپنی کٹی میں
سے بیٹھا ہوا نظارہ کرتا ہوں۔ ساحر سجپوری سات سمندر پار کی چاشنی کا مزا چکھ
آئے اور اب نعوذ باللہ معجزۂ عیسوی سے بڑھکر معجزے دکھانے کی تیاری میں
ہیں آجکل پرانے ولدسوں کو توڑ کر نئے طرز کی قلعہ بندی کے نقشے علمی شعبوں
کے لئے تیار کر رہے ہیں ساحر بنگالہ نے کہا کہ بندہ اب رخصت بنگالے سحر میں
جا کر نئی جان ڈالوں گا چنانچہ سمندر پار رنگون کے کنارے ایک طلسمی پتلا بنانے
میں مشغول ہیں کہیں وہ پتلا تیار ہو گیا اور اسمیں جان پڑ گئی تو وہ ساحر سحر شکن ہو جائیں گے
ساحر بہو حافظ دیو اور ساحر ٹرنکوے ساحرانِ فرنگ کے ہاتھ پر بیعت کر سحر فرنگ کے
حلقہ بگوش ہو کر خانہ بدوشی اختیار کی ہے قادر کو لیو نے ایک نئے جادو گری کی دہرہ دون میں
بنیاد ڈالی ہے اور اسی کے قریب اپنے کرشموں کا منڈل بنایا ہے لہذا اب میں بھی یہ کہتا ہوا
رخصت ہوتا ہوں ۔ "زندہ باد کالج۔ پائندہ باد کالج" محمد بدر الدین